مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ۔ حافظ محمد یحیٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۶۔ عدد ۵۔ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ۔ ماہ نومبر ۱۹۹۵ء

فہرست مضامین

شذرات

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ نے اپنے گذشتہ سال کے جلسے ہی میں دارالمصنفین میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے علمی مذاکرہ کے انعقاد کی تجویز منظور کی تھی، جس کی توثیق اس نے اپنے اس سال کے جلسے میں بھی کی، لیکن متعدد اسباب سے اس کی جانب پیش قدمی رکی ہوئی تھی۔ اعظم گڈھ ایک پس ماندہ ضلع ہے جو آمد و رفت کے جدید وسائل و ذرائع اور سہولت و آسایش کے نئے سامان و اسباب سے محروم ہے۔ اولاً تو یہاں پہنچنا ہی دشوار ہے اور پہنچ جانے والوں کے شایان شان قیام کا نظم و اہتمام اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ اس کے علاوہ دارالمصنفین کے وسائل و ذرائع محدود ہیں، اس کی وجہ سے وہ غیر متوقع مصارف کا کوئی بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس سال بھی رابطہ ادب اسلامی کے علمی مذاکرہ کو ملتوی کر دیا گیا تھا مگر وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا۔ اکتوبر کے اوائل میں ہندوستان میں رابطہ کے جنرل سکریٹری مولانا سید محمد رابع ندوی نے ٹیلی فون سے کہلایا کہ اگر کوئی خاص عذر نہ ہو تو اس سال رابطہ کا جلسہ دارالمصنفین ہی میں کیا جائے۔ میں نے مذاکرہ کی تاریخیں قریب آجانے اور موضوع کے غیر مناسب ہونے کا ذکر کیا تو انہوں نے قدرے تامل کے بعد ان میں تبدیلی فرمادی جس کے بعد پروگرام طے پا گیا۔

یہ سب طے ہوتے اکتوبر کا پہلا عشرہ گذر گیا، ہمارے رفقائے کار گھبرا رہے تھے کہ ایک ماہ میں تیاری کیسے ہوگی؟ راقم کے دست و بازو اور دارالمصنفین کے جوائنٹ سکریٹری جناب عبدالمنان بلالی صاحب، علی گڈھ جاکر بیمار ہوگئے تھے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے بھروسے اور دارالمصنفین کے کمزور و ناتواں کارکنوں کے سہارے تیاری شروع ہو گئی۔ اس کے مقامی ارکان جناب مرزا امتیاز بیگ اور ڈاکٹر سلمان سلطان نیز دوسرے مخلصین اور ہمدردوں، شبلی کالج کی انتظامیہ کے ذمہ داروں، اساتذہ اور غیر تدریسی عملہ سے بھی ہر قسم کا تعاون ملا۔ بلالی صاحب کی آمد کے بعد تیاری میں مزید تیزی آگئی۔ لیکن مجھ کو رہ رہ کر خیال ہو رہا تھا کہ تار اور ڈاک کا نظام بہت خراب ہے، ممکن ہے دعوت نامے ہی نہ پہنچیں اور پہنچیں تو وقت کی کمی کی وجہ سے مقالے نہ تیار کئے جا سکیں، مرکزی شہروں سے اعظم گڈھ کی دوری اور الگ تھلگ ہونا بھی رکاوٹ بن سکتا ہے اور جب مدعوئین اور مقالہ نگار کی شرکت ہی نہ ہوگی تو یہ ساری تیاری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ لیکن یہ سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے اور حضرت مولانا علی میاں

مدظلہ کی دعا، توجہ اور اخلاص نے اپنا کرشمہ دکھایا، تیاری کے زمانے میں مولانا محمد رابع ندوی ٹیلی فون سے برابر تسلی و اطمینان دلاتے رہے جس سے ہمارے کارکنوں کو بڑا حوصلہ ملتا رہا، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اور مدرسۃ الاصلاح کے بعض اساتذہ، جامعۃ الرشاد کے ناظم مولانا مجیب اللہ ندوی اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے مولانا نظام الدین اصلاحی نے بھی آکر ہر طرح کی امداد کا یقین دلایا۔

۷/ نومبر ہی سے دارالمصنفین میں اس کے اور علامہ شبلی مرحوم کے قدردانوں اور مخلصین کا اجتماع ہونے لگا، سب سے پہلے مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ کے معزز رکن جناب ضیاء الحسن فاروقی دہلی سے تشریف لائے اور رہنمائی و نگرانی فرمانے لگے، ان کو علمی و تعلیمی کاموں اور سیمناروں کا وسیع تجربہ ہے۔ مولانا مستقیم احسن اعظمی بمبئی سے سیمنار میں شرکت اور ہم لوگوں کی معاونت کے لئے آگئے تھے، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر اور مولانا حمید الدین فراہی کے پوتے ڈاکٹر عبید اللہ بھی پہلے ہی سے آکر انتظامی امور میں ہاتھ بٹانے لگے۔ علامہ شبلی مرحوم کے بھتیجے جناب فاروق نعمانی نے پیرانہ سالی کے باوجود الہ آباد سے آکر مذاکرہ کی رونق بڑھائی، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، مولانا سید محمد رابع ندوی و مولانا سید محمد واضح ندوی کے ہمراہ ۱۰/ کی صبح کو پہنچنے والے تھے مگر ان لوگوں کو سب سے زیادہ مذاکرہ کی فکر اور ہم لوگوں کی دشواری و ناتجربہ کاری کا اندازہ تھا اس لئے یہ تمام حضرات ۹/ کو دوپہر کے وقت ہی تیاریوں کا جائزہ لینے اور ضروری مشورے اور ہدایتیں دینے کے لئے تشریف لائے اور عصر بعد جامعہ اسلامیہ مظفر پور کے جلسے میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ ۹/ ہی کو ندوۃ العلماء کے بعض اساتذہ طلبہ کی ایک ٹیم لے کر پہنچے جو آخر تک مذاکرہ کا ہر چھوٹا بڑا کام پوری دلچسپی اور شوق سے انجام دیتے رہے۔

ان کے علاوہ جن حضرات کی تشریف آوری اور مقالہ خوانی سے اس مذاکرۂ علمی کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا، ان کے اسماء تقدیم و تاخیر کا لحاظ کئے بغیر حسب ذیل ہیں۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری (مبارکپور، اعظم گڈھ) ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی (استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ) پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) پروفیسر عبدالودود اظہر (نہرو یونیورسٹی) مولانا مفتی محمد ظہور ندوی و مولانا سعید الرحمن الاعظمی (ندوۃ العلماء لکھنؤ) پروفیسر راشد ندوی، پروفیسر عبدالباری، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی (علی گڈھ) پروفیسر منظر اعظمی (جموں یونیورسٹی) پروفیسر ڈاکٹر احتشام

احمد ندوی (کالی کٹ یونیورسٹی) پروفیسر عبدالحلیم ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی (جامعہ ملیہ دہلی) ڈاکٹر محمد محسن عثمانی (نہرو یونیورسٹی دہلی) مولانا شاہ شبیر عطا ندوی (سلون، رائے بریلی) مولانا ریاض الدین فاروقی، پروفیسر عبدالوہاب (اورنگ آباد) پروفیسر سید عبدالباری (اودھ یونیورسٹی) ڈاکٹر محمد حسان خاں (بھوپال یونیورسٹی) ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط (کل گاؤں، مہاراشٹر) جناب انیس چشتی (پونہ، مہاراشٹر) مولانا عنایت اللہ سبحانی اصلاحی (جامعۃ الفلاح بلریا گنج) مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا محمود الازہار ندوی (دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) مولانا عبدالمبین ندوی (سراج العلوم، جھنڈا نگر، نیپال) جامعہ علی گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اور دارالعلوم مئو کے بہت سارے اساتذہ و طلبہ بھی اکثر جلسوں میں شریک ہوئے۔

مذاکرہ علمی کا افتتاحی جلسہ ۱۰/ نومبر ۱۹۹۵ء کو مغرب بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا۔ جس کی ابتدا ہمارے رفیق کار مولوی عمیر الصدیق دریابادی نے علامہ شبلی کے قطعات عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی اور فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالم، پڑھکر کی، اس کے بعد راقم نے خطبہ استقبالیہ پڑھا اور مولانا محمد رابع ندوی نے رابطہ کی رپورٹ پیش کی اور جناب صدر کے صدارتی کلمات کے بعد پروفیسر ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد راشد ندوی نے بھی حاضرین سے خطاب کیا، اس کے بعد مقالات کے چھ جلسے ہوئے جن کی صدارت ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر عبدالحلیم ندوی، راقم الحروف اور پروفیسر محمد راشد ندوی نے کی، ان جلسوں میں ۴۰ سے زیادہ مقالے پیش کئے گئے، مقالہ نگاروں کی فہرست میں مولانا علی میاں کا نام نامی بھی تھا۔ انہی کی صدارت میں اختتامی جلسہ بھی ہوا جس میں ان کے موثر خطاب کے علاوہ تجویزیں پیش ہوئیں اور شکریے کی رسم بھی انجام پائی۔

یہ سارے جلسے دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کے زیر اہتمام شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے کانوکیشن ہال میں ہوئے، ۱۱/ نومبر کو مقالات کا چوتھا جلسہ مولانا تقی الدین ندوی، مظاہری کے زیر انتظام جامعہ اسلامیہ مظفر پور میں ہوا، جس کے بعد انہوں نے ایک پر تکلف عشائیہ دیا، ۱۰/ نومبر کو جامعۃ الرشاد نے عشائیہ اور ۱۲/ نومبر کو جامعۃ الفلاح نے ظہرانہ دیا، غرض تین چار دنوں تک دارالمصنفین میں بڑی چہل پہل رہی، علامہ شبلی کی روح بھی عالم بالا میں مسرور ہوئی ہوگی کہ ان کے محبوب موضوعات، سیرت، سوانح اور تذکرہ نگاری کا جائزہ لینے اور اسے وسعت و ترقی دینے کے لئے ملک کے گوشے گوشے سے اہل علم و اصحاب دانش ان کے آستانے پر تشریف لائے۔

مقالات

مولانا شبلیؒ کی ایک عدیم المثال و عظیم الشان تصنیف
سیرۃ النبیؐ

از محمد عارف عمری، رفیق دارالمصنفین

(۲)

پچھلی اشاعت میں سیرت کے زمانہ تصنیف ہی میں اس کے خلاف ہونے والی معاندانہ مہم اور اس کی ناکامی کا ذکر آیا تھا، کتاب کی اشاعت کے بعد بھی بعض طبقوں کی جانب سے اس پر کچھ اعتراضات ہوئے، جو عموماً بے وزن اور ناقابل التفات تھے اب بھی اس کی مخالفت اور بیجا سطحی اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے، جن میں انہی فرسودہ اور لغو باتوں کا اعادہ بہت زور شور سے بظاہر محققانہ لیکن حقیقتاً غیر محققانہ اور مبتذل انداز میں کیا جارہا ہے۔

مضمون کے آخر میں فرسودہ اور مہمل ہونے کے باوجود چند اعتراضات کا جائزہ لے لینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ان نئے اور نوآموز معترضین کے "تحقیقی معیار کا درجہ" اور علمی بددیانتی کا اندازہ ہو جائے۔

ہم نے چند ہی اعتراضات کو ہاتھ لگایا ہے، انہی سے دوسرے اعتراضات کے "معیار" کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا شبلیؒ نے مقدمہ سیرۃ النبیؐ	بعض روایتوں لے مصنف سیرۃ النبیؐ کے گریز کا سبب

میں بالکل بجا طور پر کتب حدیث کے واقعات کو سیرت کی روایتوں کے مقابلہ میں زیادہ مستند اور قابل ترجیح قرار دیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے کتب حدیث کی بعض روایتوں کو نظرانداز بھی کیا ہے جس کو قلت علم اور عدم تدبر کی بنا پر تعارض قرار دیدیا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مولانا نے اپنے وضع کردہ اصول سے انحراف کیا ہے۔

در حقیقت بخاری، مسلم اور حدیث کے دوسرے مستند مجموعے سیرت کی کتابوں کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ قابل ترجیح ہیں کیونکہ ان میں محدثین نے صحت کا خاص التزام کیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کتب حدیث کی ہر روایت یکساں درجہ کی ہے اور اسکی کسی روایت پر جرح و تنقید کی گنجایش ہی نہیں ہے، ممکن ہے کہ روایت کو بلا بحث و تمحیص اختیار کر لینا اور اس کی بے جا تاویلات کرنا کسی مکتب فکر کا طرۂ امتیاز ہو مگر مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ میں اس طریقہ کار کو روایت پرستی سے تعبیر کیا ہے۔[1]

سیرۃ النبیؐ میں مولانا شبلی نے بعض ایسی روایتوں سے یقیناً پہلوتہی کی ہے جو اصول روایت مطابق چاہے درست ہوں مگر انکا مضمون درایتاً صحیح نہیں ہے، ذیل میں اس نوع کی بعض روایتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

حضرت جویریہؓ کا واقعہ | ام المومنین حضرت جویریہؓ کا مفصل واقعہ ابن اسحاق کی ایک روایت میں بیان ہوا ہے اور اس روایت کو ابن ہشام اور امام ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے، اسکی تفصیل یہ ہے،

"ام المومنین حضرت جویریہؓ بنو مصطلق کے سردار حارث ابن ابی ضرار کی بیٹی تھیں،

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول: ص ۱۸۱۔

ان کے شوہر غزوہ بنو مصطلق میں مارے گئے اور وہ دوسرے قیدیوں کے ہمراہ گرفتار ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئیں تقسیم غنائم کے بعد حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئیں، انہوں نے حضرت ثابتؓ سے اپنی آزادی کے لیے کچھ رقم طے کر لی جسے اصطلاح میں مکاتبت کہتے ہیں پھر رقم کی فراہمی کے سلسلہ میں وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئیں، اس وقت حضرت عائشہؓ بھی آپؐ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں ان کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ جویریہ صاحب جمال اور دلکش شکل و صورت کی مالک ہیں اس لیے مجھ کو انکا آپؐ کے پاس آنا ناگوار ہوا، مبادا آپؐ بھی انکے حسن و جمال سے متاثر ہو جائیں، بہر حال انہوں نے جب آپؐ سے اپنی آزادی کے لیے مالی تعاون کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر تمہارے ساتھ اس سے اچھا برتاؤ کیا جائے تو کیا تم اسے قبول کرو گی، انہوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہاری طرف سے رقم ادا کر دوں اور تمہیں اپنی زوجیت میں لے لوں، حضرت جویریہؓ نے اسے منظور کیا اور ازواج مطہرات میں شامل ہو گئیں"

مذکورہ بالا روایت میں حضرت عائشہؓ کے دل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جس خیال کے آنے اور اسکے درست ثابت ہونے کا ذکر ہے اس کی قباحت بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ مولانا شبلی نے اول تو اس روایت کو سیرۃ النبیؐ میں بڑے احتیاط سے نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

"ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے جو یقیناً انکی ذاتی رائے ہے"

اس کے بعد روایت کا یہ حصہ نقل کیا ہے، جس میں حضرت عائشہؓ کے خیال و تصور کا ذکر ہے، دوسرے مولانا نے اس روایت کو نظرانداز کر کے ایک دوسری روایت کو

اختیار کیا ہے، جو یقیناً مرسل ہے، مگر حافظ ابن حجر نے اس کی توثیق کی ہے۔

ابن اسحاق کی روایت کو نظر انداز کرنے کا سبب مولانا شبلی کے نزدیک یہی تھا کہ وہ حضور اکرمؐ کی طرف کسی ایسے خیال کی نسبت بھی صحیح نہیں سمجھتے جو شان نبوت کے منافی ہو اور جس سے آپؐ کے معیار اخلاق پر حرف گیری کا موقع دشمنان اسلام کو حاصل ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابن سعد نے بھی اسی مضمون کی روایت حضرت عائشہؓ سے بسند متصل روایت کی ہے، جس کا راوی اول واقدی ہے[1]

کنانہ اور اس کے بھائی کا واقعہ | غزوۂ خیبر کے ذکر میں کنانہ بن ابی الحقیق کے بارہ میں مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ:

"خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے یعنی یہ کہ اول آپؐ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں لیکن جب کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کرکے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی۔"

یہ روایت بھی متصل اور صحیح ہے، مگر مولانا شبلی نے اس کو نظر انداز کیا ہے کیونکہ اس کا مضمون از روئے درایت صحیح نہیں ہے، مولانا لکھتے ہیں:

"کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے

[1] طبقات ابن سعد جلد ۸، ص ۳۰، مطبوعہ لائیڈن۔

آگ جھاڑی جائے، رحمت للعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔

وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لیے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے؟"

بکر بن عبد الرحمن کی روایت | کنانہ کے واقعہ کی تفصیل پر بحث کرتے ہوئے مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ:

"اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا اضافے ہو گئے ...... اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبد الرحمن سے جو روایت متصل نقل کی ہے اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے یعنی دونوں قتل کیے گئے۔"[1]

اس روایت کو خود مولانا شبلی نے متصل بتایا ہے، مگر اس کے باوجود اسکو اختیار کرنا تو درکنار اس کی تردید کی ہے، کیونکہ اول تو اس روایت کے خلاف انکے پیش نظر مضبوط دلائل تھے جن کو انھوں نے سیرۃ النبیؐ میں درج کیا ہے، دوسرے اس روایت کا مضمون درست نہیں ہے، ذیل میں پوری روایت کے مباحث کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنانہ اور اس کے بھائی سے کہا کہ اگر تم دونوں نے کوئی چیز چھپائی جس کا علم مجھ کو بعد میں ہوا تو تم دونوں کی گردنیں ماردی جائیں گی اور آل و اولاد لونڈی غلام بنالیے جائیں گے۔

۲۔ خزانہ مل جانے کے بعد اس کو چھپانے کے جرم میں وہ دونوں قتل کردیے گئے۔

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول، ص ۴۹۵۔

۳۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک آدمی کو بھیجا جو صفیہ (زوجہ کنانہ) کو لیکر آیا۔

۴۔ صفیہ کو اس آدمی نے (ظاہر ہے کہ کوئی صحابی رہے ہوں گے) ان دونوں کی لاشوں کے پاس سے گزارا۔

۵۔ حضورؐ نے ان صاحب سے دریافت فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ میں اسے طیش دلانا چاہتا تھا۔

کیا معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عملی تصویر تھی! جس کو رد کر دینا حدیث اور فن حدیث کے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔؟

حقیقت یہ ہے کہ روایت کے ساتھ درایت پر بھی نگاہ رکھنا ایک محقق کیلئے ضروری امر ہے، سیرۃ النبیؐ کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں ان دونوں پہلوؤں پر نظر رکھی گئی ہے، درایت کی اہمیت کا اعتراف خود مولانا شبلی کے نکتہ چینوں اور خوردہ گیروں کو بھی ہے، مگر مولانا جب محدثین کے اس اصول سے کام لیتے ہیں تو پتہ نہیں کیوں رواۃ پرستوں کی جبینوں پر شکن آجاتی ہے۔

مولانا شبلی پر تنقید کرنے والے عفان بن مسلم کی ایک منقطع روایت کو جو سیرۃ النبیؐ میں نقل ہوئی ہے صحیح اور موصول قرار دیتے ہیں اور خود ہی اس روایت کی سند اس طرح نقل کرتے ہیں:

"اخبرنا عفان بن مسلم اخبرنا حماد بن سلمہ قال اخبرنا عبید اللہ بن عمر قال واظنہ عن نافع عن ابن عمر"

اس سلسلہ سند میں راوی کی اس تصریح "اظنہ عن نافع عن ابن عمر" کے بعد بھی روایت کو سنداً قوی تر اور اس کے مضمون کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے

موصولاً مروی بتا کر اس کی توثیق کرنا یا تو نری غباوت کی دلیل ہے یا پھر دیدہ دلیری ہے۔

حدیث بدء الوحی پر مولانا شبلی کا اشکال

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے نازل ہونے کا مفصل واقعہ جس میں فرشتہ غیب کا نظر آنا، اس کو دیکھ کر آپؐ کا خوفزدہ ہو جانا، حضرت خدیجہؓ کا آپؐ کو تسلی دینا اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے جانا وغیرہ مذکور ہے، صحیح بخاری میں دو جگہ ہے، باب بدء الوحی میں یہ واقعہ اسی قدر ہے، البتہ باب التعبیر میں اس کے بعد یہ اضافہ بھی ہے۔

"چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرتؐ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں' دفعۃً حضرت جبرئیلؑ نظر آتے تھے اور کہتے تھے" اے محمدؐ! تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو" لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لیے رک جاتی تھی تو پھر آپؐ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرئیلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپؐ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں"۔

باب التعبیر کے اس اضافہ پر مولانا شبلی نے اشکال وارد کیا ہے، چنانچہ وہ از روئے روایت اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے[1]۔

مولانا شبلی نے روایت کے پہلو بہ پہلو از روئے درایت بھی اس حصہ پر تنقید کی ہے، لکھتے ہیں:

---

[1] سیرۃ النبیؐ، جلد اول، ص ۲۰۵۔

"لیکن جبکہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفر شام میں بمقام (بصری) جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے تھے، اسکی تمام شاخیں آپؐ پر جھک آئیں جس سے بحیرا نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کیا، جبکہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ "آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا، جبکہ صحاح میں موجود ہے کہ" نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپؐ اس قدر خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپؐ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبریلؑ کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا، حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سُنی کہ "میں خدا ہوں" تو کیا انکو کوئی شبہ پیدا ہوا؟[1]

اس موقع پر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ باب التعبیر میں مذکور واقعہ کی تمام تفصیلات جو متصلاً مروی اور باب بدء الوحی میں بھی مذکور ہیں، ان کے بارہ میں سیرۃ النبیؐ میں کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، البتہ مولانا شبلی نے فتح الباری سے ایک مفصل مکالمہ ضرور نقل کیا ہے جس میں اس حدیث کے متعلق بعض معترضین کے اشکالات اور محدث اسماعیلی کے جوابات مذکور ہیں، مولانا شبلی اس مکالمہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

"حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصہ اول کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل

[1] سیرۃ النبی جلد اول، ص ۲۰۴۔

کیا ہے کہ "ایک پیغمبر کو نبوت میں کیونکر شک ہو سکتا ہے اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین حاصل ہو سکتی ہے" پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے" نبوت ایک امر عظیم ہے، اس کا تحمل دفعۃً نہیں ہو سکتا، اس لیے پہلے آنحضرتؐ کو خواب کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعۃً فرشتہ نظر آیا تو آپؐ اقتضائے بشریت سے خوفزدہ ہو گئے، حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپؐ کو پورا یقین حاصل ہو گیا، محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

فلما سمع کلامہ ایقن بالحق واعترف بہ۔

جب آپؐ نے ورقہ کا کلام سُنا تو آپؐ کو حق کا یقین آگیا اور آپؐ نے اس کا اعتراف کیا۔[1]

مولانا شبلی کے مذکورہ بالا بیان میں "حصہ اول" کا جملہ معنی خیز ہے اور دراصل اس سے اس روایت کا استثناء مقصود ہے، جس میں حضور اکرمؐ کے بار بار مضطرب ہونے اور خودکشی کا ارادہ کر لینے کا ذکر ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث بدء الوحی کے قدیم معترضین کے اشکال کا ماحصل یہ ہے کہ اس سے نبوت کی تشکیک لازم آتی ہے اور باب التعبیر کے اضافی حصہ پر مولانا شبلی کے درایتی تنقید میں بھی یہی سبب بیان کیا گیا ہے، تو کیا دونوں اشکال بعینہ ایک ہیں۔؟

دراصل قدیم معترضین اور مولانا شبلی کے درمیان نتیجہ کا اتفاق ضرور ہے، مگر دونوں کے بنائے استدلال الگ ہیں، قدیم معترضین نے روایت کے بعض الفاظ ڈر،

[1] سیرۃ النبی جلد اول، ۲۰۳، ۲۰۴۔

حزن وغیرہ کو تردد کا حامل قرار دیا ہے، جس کی تردید محدث اسماعیلی نے اپنے نقطۂ نظر سے کی ہے مگر مولانا شبلی کا استدلال ان الفاظ سے نہیں ہے ورنہ وہ یہ کیوں لکھتے کہ :

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے " مجھکو ڈر ہے " لیکن یہ تردد اور ہیبت' یہ اضطراب جلال الٰہی کا تاثر (اور نبوت کے بار گراں کی عظمت کا تخیل) تھا" ۱؎

مولانا شبلی کا استدلال روایت کے سیاق سے ہے، یعنی حضور اکرمؐ کے بار بار مضطرب ہونے کی صورت میں فرشتہ کا یہ کہنا کہ انک لرسول اللہ حقا (آپؐ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں) اضطراب کے مفہوم کا تعین کرتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ میں ہے :

فَلَمَّا رَآى اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ	سو جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ انکے ہاتھ
اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ	اس کھانے تک نہیں بڑھتے تو ان سے
خِيْفَةً، قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّا	متوحش ہوئے اور ان سے دل میں
اُرْسِلْنَا اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ہ	خوفزدہ ہوئے، وہ فرشتے کہنے لگے
(ہود : ۷۰-۱۱)	ڈرو مت ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں

سورۃ الحجر میں بھی یہی مضمون لفظ خوف کے بجائے وجل سے بیان ہوا ہے اور دونوں ہی مقامات پر حضرت ابراہیمؑ کے خوفزدہ ہونے کی صورت میں فرشتوں نے ان سے پہلی بات یہی کہی ہے کہ آپ خوفزدہ نہ ہوں۔

اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے تذکرہ میں سورۂ طہٰ، نمل اور قصص تینوں جگہ اللہ رب العزت

۱؎ سیرۃ النبی جلد اول، ص ۲۰۳

نے پہلی بات یہی کہی ہے کہ مت ڈرو۔

اس پس منظر میں باب التعبیر کے اضافی حصہ میں بھی قرآنی اسلوب کے مطابق یہی ہونا چاہیے تھا کہ فرشتہ آپؐ کو خوفزدہ نہ ہونے کی تلقین کرتا۔ اضطراب کی کیفیت میں "انک لرسول اللہ حقا" کے جملہ سے خود بخود اس کے مفہوم میں شک و تذبذب کا معنی پیدا ہو جاتا ہے اور یہی مولانا شبلی کا بنائے استدلال ہے۔

آج کل کے تحقیقی مقالوں کا معیار یہی ہے کہ مدعی تحقیق کو اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ جس کی نسبت جس خیال کا اظہار کر رہا ہے وہ اس کا قائل ہے بھی یا نہیں، چنانچہ بعض تحقیق کے دعویداروں کا مبلغ علم یہی ہے کہ انہوں نے مولانا شبلی کے اشکال کو سرے سے سمجھا ہی نہیں اور محض اعتراض کے شوق میں فتح الباری سے قدیم معترضین کے اشکالات نقل کر کے ان کو مولانا شبلی کی طرف منسوب کر دیا اور ڈھٹائی کی حد یہ ہے کہ فتح الباری میں ان اعتراضات کے جو جوابات دیے گئے ہیں ان کو مولانا شبلی کی تردید کے نام پر پیش کیا گیا ہے، یا بعض ایسے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں جن کا تعلق مولانا شبلی کے بجائے قدیم معترضین کے اشکالات سے ہے۔

محدث اسماعیلی کا نقطۂ نظر مولانا شبلی نے اپنے استدلال کی تائید میں محدث اسماعیلی کے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے، جو اس حدیث کے معترضین کے مدافع ہیں، مگر اس کے باوجود ایک خاص مدت میں وہ بھی شک و تذبذب میں مبتلا رہنے کے قائل ہیں، مولانا شبلی نے انکی درج ذیل عبارت سیرۃ النبی میں نقل کی ہے :

فلما سمع کلامہ ایقن بالحق	جب آپؐ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپؐ کو
واعترف بہ۔	حق کا یقین آگیا اور آپؐ نے اسکا اعتراف کیا۔

اس عبارت میں یہ نکتہ آفرینی کی گئی ہے کہ سمع ویقین اور اعتراف کی ضمیروں کو بجائے حضورؐ اکرم کے ورقہ بن نوفل کی طرف راجع کیا گیا ہے، یعنی ورقہ کو آپؐ کا کلام سننے کے بعد آپؐ کی نبوت کا یقین آیا اور اس نے آپؐ کی نبوت ورسالت کی تصدیق کی۔

اس نکتہ کو تسلیم کرنے پر پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ کی نبوت ورسالت کی تصدیق واعتراف کے بعد ورقہ بن نوفل اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے درمیان کیا فرق باقی رہا؟ یقین واعتراف ہی تو ایمان کا مجموعہ ہے مگر اسکے باوجود ورقہ کا نام السابقون الاولون کی فہرست میں کیوں شامل نہیں ہے؟

ممکن ہے کہ اس نکتہ کے مؤیدین یہ کہیں کہ ورقہ چونکہ اعلان دعوت کے حکم سے پہلے وفات پاچکے تھے اس لیے انکا نام اس فہرست میں نہیں ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے سیرت ابن اسحاق کی ایک روایت نقل کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ ورقہ اس وقت تک موجود تھے، حافظ ابن حجر کے الفاظ یہ ہیں:

وفی السیرۃ لابن اسحاق	سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ ورقہ کا
ان ورقۃ کان یمر ببلال	گزر حضرت بلالؓ کے پاس اس حال
وھو یعذب وذلک یقتضی	میں ہوتا تھا کہ وہ ستائے جاتے تھے،
انہ تاخر الی زمن الدعوۃ	اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ورقہ اعلان
والی ان دخل بعض الناس	دعوت تک موجود تھے جبکہ بعض لوگ
فی الاسلام [1]	دائرۂ اسلام میں داخل ہوچکے تھے۔

[1] فتح الباری، جلد اول، ص ۲۶۔ مطبوعہ مصر۔

غرض ضمیروں کا مرجع بدل دینے سے حقیقت نہیں تبدیل ہوگی، محدث اسماعیلی کا مسلک وہی ہے جو مولانا شبلی نے بیان کیا ہے، حافظ ابن حجر نے محدث مذکور کے موقف کو زیادہ واضح طور پر ایک دوسری جگہ نقل کیا ہے جہاں ضمیروں کا مرجع متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

والخشیۃ المذکورۃ اختلف	حدیث میں ڈر کا جو ذکر ہے اس کے
العلماء فی المراد بھا علی اثنی	مفہوم میں علماء کے بارہ مختلف اقوال
عشر قولا اولھا الجنون وان	ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ آپ کو جنون کا
یکون مارآہ من جنس الکھانۃ	خوف لاحق ہوگیا یا یہ کہ آپ کو شبہ
جاء مصرحا بہ فی عدۃ طرق	ہوا کہ بھوت پریت کے قبیل کی کوئی
وابطلہ ابوبکر بن العربی	شئے آپ نے دیکھ لی، اس کا واضح ذکر
وحق لہ ان یبطل لکن حملہ	بعض طرق میں ہے، مگر قاضی ابوبکر
الاسماعیلی علی ان ذلک حصل	بن العربی نے اس کی تردید کردی ہے
لہ قبل حصول العلم الضروری	اور ان کا اسے باطل قرار دینا برحق ہے
لہ ان الذی جاءہ ملک	مگر اسماعیلی نے اس کی تاویل یوں کی ہے
وانہ من عند اللہ تعالیٰ [1]	کہ یہ کیفیت آپ پر اسوقت تک محض طاری
	رہی جب تک کہ آپ نے اسکا ضروری
	علم حاصل نہ کرلیا کہ واقعی جو شئے آئی
	وہ فرشتہ ہی تھا اور اللہ کی طرف سے
	آیا تھا۔

[1] فتح الباری، جلد اول، ص ۲۳۔ مطبوعہ مصر۔

مندرجہ بالا عبارت سے محدث اسماعیلی کے اس موقف کی صریح وضاحت ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ نے ورقہ بن نوفل سے ضروری علم حاصل کیا اور وہ علم ضروری کیا تھا؟ وہ اس بات کا متیقن تھا کہ جو شئے آپؐ کو نظر آئی وہ کیا واقعتاً خدا کا فرستادہ تھا۔

جامع سیرۃ النبی کے اضافے

سیرۃ النبیؐ کی جو جلدیں مولانا شبلی نے لکھی ہیں وہ انکی حیات میں شایع نہ ہو سکیں، یہ سہرا ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کے سر ہے کہ انہوں نے انکو طبع کرایا اور بقیہ جلدیں خود لکھ کر اپنے استاد کے مجوزہ خاکہ کی تکمیل کی سید صاحبؒ نے سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد کے دیباچہ میں حسرت سے لکھاہے:

"مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے، انکو آستانہ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔"[1]

سید صاحب نے اپنے استاد کے احترام میں سیرۃ النبی کے مسودہ کو جوں کا توں شایع کیا، البتہ اس میں جابجا حسب ضرورت مناسب اضافہ کیا، مگر اس میں بھی حدِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی عبارت قوسین میں درج کی، لیکن ظاہر ہے کہ جامع سیرت کے یہ اضافے اصل تصنیف ہی کا حصہ ہیں۔

لیکن یہ عجیب بددیانتی ہے کہ اب معروضیت کا نام دے کر جو تنقیدیں کیجاتی ہیں ان میں کہیں تو جامع سیرت کے اضافہ سے اس لیے صرف نظر کر لیا جاتا ہے کہ تنقید نگاروں کو بے حقیقتی واقع ہوتی ہے اور کہیں اس کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے گویا ان کا اصل کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور کہیں تو یہ ڈھٹائی بھی کی جاتی ہے کہ جامع سیرت کے معروضات کو اپنے لفظوں میں پیش کر دیا جاتا ہے اور اس کے حوالہ کی

[1] دیباچہ طبع اول، ص ۸۔

ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی ہے۔

آج کل کے نام نہاد معروضی مطالعے اسی نوعیت اور درجے کے ہوتے ہیں۔ ذیل میں مذکورہ بالا تینوں اقسام کی محض ایک ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ میں مہاجرین حبشہ کی فہرست طبری کے حوالہ سے نقل کی ہے، جس پر یہ تبصرہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ روایت ابن سعد نے واقدی سے نقل کی ہے، حالانکہ اس پر مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک مفصل حاشیہ بھی ہے جس سے محض اس لیے نگاہیں چرائی جاتی ہیں کہ اس سے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے، اس حاشیہ میں سید صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس سلسلہ کی تمام تفصیلات یکجا کر دی ہیں، بلکہ واقدی کی روایت پر تنقید بھی کی ہے، اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"حبشہ کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے....

واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو سبرہؓ اور حضرت ابو حاتمؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں، اس سلسلہ میں واقدی سے ایک بڑی فروگذاشت یہ ہوئی کہ انہوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا، لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ[۱۲] آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی اضافہ کیا (زرقانی علی المواہب جلد اول، ص ۳۱۴) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگذاشت پر گرفت کی ہے (فتح الباری، جلد ۷، ص ۱۴۳) ...."[1]

۲۔ حضرت ابوطالب کے ایمان کی بحث میں مولانا شبلی کے نقطہ نظر سے جامع سیرت نے

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول: حاشیہ ص ۲۳۵۔

اختلاف کیا ہے اور اس کو واضح طور پر اسی مقام پر حاشیہ میں درج بھی کیا ہے نکتہ چینوں کی جسارت ملاحظہ ہو کہ اسی کو اپنے الفاظ میں کچھ کمی بیشی اور ردوبدل کے ساتھ نقل کرکے جامع سیرت کے بیان کو اپنی تائید میں نقل کرتے ہیں، گویا جامع سیرت نے کہیں اور یہ تحریر لکھی ہو۔

۳۔ غزوہ بنی المصطلق کے ذکر میں صحیحین کی ایک حدیث کو جس کی سند کا آخری حصہ متن حدیث کے بعد درج ہے، مولانا شبلی نے منقطع قرار دیدیا ہے، سید صاحب نے اپنے حاشیہ میں اس کی تصحیح کر دی ہے، لکھتے ہیں:

"معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، ورنہ متن حدیث کے بعد یہ تصریح ہے کہ "حدثنی ہذا الحدیث عبداللہ بن عمر و کان فی ذلک الجیش" یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے، (مسلم کتاب الجہاد و بخاری کتاب العتق) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع باقی نہیں رہتی ہے"[1]

اس وضاحت کے باوجود مدعیان تحقیق نے کئی صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں اور سید صاحب کے حاشیہ کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔

کذب بیانیاں | آج کل کے معروضی مطالعوں میں سیرۃ النبی کی مخالفت کا جوش نکتہ چینوں پر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ وہ کذب وافتراء اور دروغ بیانی سے بھی دریغ نہیں کرتے، مثلاً حضرت حمزہؓ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ جس کو تقریباً تمام ہی ارباب سیر نے اس طرح بیان کیا ہے کہ انہوں نے محض اپنے بھتیجے یعنی حضورؐ کے جوش حمایت

۱؎ سیرۃ النبیؐ، جلد اول: حاشیہ ص ۴۱۵۔

میں اسلام قبول کیا تھا، مولانا شبلی نے اس عام روایت کو نقل کرکے ایک روایت یہ بھی پیش کی ہے کہ:

"آنحضرتؐ کے جوش حمایت میں انہوں نے اسلام کا اظہار تو کردیا، لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعتہً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، بالآخر غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے"[1]

مولانا شبلی نے اس روایت کا ماخذ امام سہیلی کی کتاب روض الانف کو بتایا ہے، لکھتے ہیں:

"حضرت حمزہؓ کے اسلام کا واقعہ عموماً سب نے لکھا ہے، لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف روض الانف میں دیکھا ہے"[2]

اس صراحت کے باوجود یہ کہنا کہ مولانا شبلی نے کسی متعین کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے، کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

حضرت خدیجہؓ سے حضور اکرمؐ کے نکاح کی تفصیلات مولانا شبلی نے جن کتابوں سے لی ہیں ان کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

"حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد و طبری میں باختلاف اجمال و تفصیل اثبات و نفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی ہے، نقل کی ہے، یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول ص ۲۳۲ سے ص ۲۳۶ تک دیکھنا چاہیے، حضرت خدیجہؓ کے مکان کا ذکر صرف طبری نے کیا ہے، ابن حنبلؒ (مسند ابن عباسؓ) میں بھی واقعات مذکور ہیں"[3]

۱؎ سیرۃ النبی جلد اول: ص ۲۲۳ ۲؎ ایضاً حاشیہ ص ۱۸۹۔

اس وضاحت کے باوجود یہ کہنا کہ مولانا نے الگ الگ جزئیات سے متعلق حوالے نہیں دیے بلکہ مبہم طور پر اور عمومی انداز میں ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے حوالے دیے ہیں، کہاں تک صداقت پر مبنی ہے۔

مولانا شبلی نے حضرت فاطمہؓ کی شادی اور ان کی رخصتی کی تفصیلات بیان کرکے یہ حاشیہ لکھا ہے:

"یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد اور اصابہ سے ماخوذ ہے"[1]

مولانا نے اس سلسلۂ بیان میں ابن سعد کی ایک روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن سعد کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہؓ کے حال میں روایت کی ہیں لیکن اسکو نظر انداز کیا ہے"[2]

ان ساری تفصیلات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ مولانا نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، دروغ بیانی نہیں تو اور کیا ہے۔

مولانا شبلی نے کعب ابن اشرف کے حسب ونسب اور اس کی دولتمندی کا بیان اس طرح کیا ہے کہ کعب کے نانا ابو رافع ابن ابی الحقیق کے مالدار ہونے کا ثبوت بخاری باب قتل النائم المشرک میں درج اس کے خطاب تاجر الحجاز سے فراہم کیا ہے اور کعب کے والد سے ابو رافع کی بیٹی کی شادی کا ذکر الخمیس کے حوالے سے کیا ہے، اس طرح کعب بن اشرف کے خاندانی وجیہ ہونے کو دکھایا ہے اور خود اسکے صاحب ثروت ہونے کا ذکر زرقانی (جلد ۲، ص ۹) میں درج ابن اسحاق وغیرہ

[1] سیرۃ النبی حاشیہ ص ۳۶۸ [2] ایضاً ص ۳۶۶۔

کی روایت سے کیا ہے[1]:

یہ تمام تفصیلات مختلف روایتوں کی جزئیات سے فراہم کی گئی ہیں، ان کو محض الخمیس میں تلاش کرنا اور یہ شکوہ کرنا کہ اس میں یہ تمام باتیں نہیں ملتی ہیں، علمی بے بصیرتی ہی تو ہے۔

کعب بن اشرف کی اسلام دشمنی کا حال مولانا شبلی نے یوں لکھا ہے:

"بدر کی لڑائی میں سرداران قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا، تعزیت کے لیے مکہ گیا، کشتگان بدر کے پردرد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی، لوگوں کو جمع کرکے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رلاتا تھا"

مولانا نے اس تفصیل کا ماخذ ابوداؤد کی اس عبارت کو بتایا ہے:

"ابوداؤد میں ہے۔ وکان کعب بن الاشرف یھجو النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویحرض علیہ کفار قریش (ابوداؤد، جلد دوم، باب کیف کان اخراج الیہود، کتاب الخراج والامارہ)"

جامع سیرت مولانا سید سلیمان ندوی نے اس حاشیہ میں یہ اضافہ کرکے مفہوم کو اور واضح کر دیا ہے:

"تفسیر ابن جریر طبری، جلد ۵، صفحہ ۹، میں ہے۔ ان کعب بن الاشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجاشھم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامرھم ان یغزوہ"[2]

ان تمام تفصیلات کو ابن اسحاق کی ایک مرسل روایت پر مبنی قرار دینا کذب و

[1] سیرۃ النبی حاشیہ ص ۳۰۵ [2] ایضاً ص ۳۰۶۔

افترا نہیں تو کیا ہے۔

مذکورہ بالا چند مثالوں ہی سے سیرۃ النبیؐ کے ناقدین کے معیار تحقیق اور انکی بددیانتی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، حیرت تو یہ ہے کہ ان ہرزہ سرائیوں کو علم وتحقیق کے نام پر پیش کیا جاتا ہے۔

غرض سیرۃ النبیؐ کے زمانۂ تالیف ہی سے اس کے خلاف معاندانہ اعتراضات کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب تک قائم ہے مگر ان سے کبھی بھی سیرۃ النبیؐ کی مقبولیت اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا، خود مولانا شبلی کی نظر سے جب یہ مہمل اور معاندانہ اعتراضات گزرے تو مولانا اس سے کبیدہ خاطر نہیں ہوئے، بلکہ سیرت کی تالیف میں اور پُرجوش ہوگئے، اسی زمانہ میں منشی محمد امین زبیری کو ایک خط میں لکھا کہ:

"میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کردیں لیکن اب روپیہ کا نہیں بلکہ میری جان کا معاملہ ہے ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤنگا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی ہے"[1]

واقعہ یہ ہے کہ مخالفین اور حاسدین کی تمامتر کوششوں کے باوجود مولانا شبلی کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، جس زمانے میں مولانا نے یہ کتاب لکھی ہے اسوقت حدیث وسیرت کے تمام مجموعے آج کی طرح دستیاب نہیں تھے، علاوہ ازیں مولانا شبلی طرح طرح کے علل وعوارض میں بھی مبتلا تھے بالآخر سیرت کی ناتمامی کا داغ اپنے سینہ پر لیکر دنیا سے رخصت ہوئے، ان سب کے باوجود آج جبکہ اسکی تالیف پر تقریباً ایک صدی کا عرصہ گزرنے کو ہے اور اس عرصہ میں سیرت پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اہل علم کا یہ متفقہ اعتراف ہے کہ ابھی تک دنیا کی کسی زبان میں سیرۃ النبیؐ کی نظیر اور اسکے ہم پایہ کتاب نہیں لکھی جاسکی ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق   ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

---

[1] مکاتیب شبلی حصہ اول: ص ۲۴۲۔

سفر نامۂ روم و مصر و شام

از

ضیاء الدین اصلاحی

ترکی کی محبت مولانا شبلی کے خمیر میں داخل تھی، ابھی ان کا عنفوان شباب ہی تھا کہ ۱۸۷۷ء میں روس و روم میں جنگ چھڑ گئی جس نے پوری اسلامی دنیا میں آگ لگادی، اس کے شعلے ہندوستان میں بھی بھڑکنے لگے تھے، ہر جگہ سلطان کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگی جارہی تھیں اور زخمیوں کے لیے چندے اکٹھا ہورہے تھے، مولانا شبلی نے بھی اعظم گڈھ میں چندہ کرکے ترکی سفیر بمبئی کی معرفت قسطنطنیہ بھجوایا[1]

ترکی اور اس کے سفر سے دلچسپی

مولانا کو ہیروز آف اسلام (ناموران اسلام) لکھنے کا خیال ہوا تو ترکی کے سفر کا خیال بھی دامنگیر ہوا کیونکہ فرماتے ہیں:

"ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا، یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی؛ کیونکہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک سلسلۂ تالیف ضرور تیار ہوسکتا ہے"[2]

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۹۵، مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۸۳ء طبع چہارم [2] مولانا شبلی نعمانی: سفر نامہ روم و مصر و شام ص ۹، مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۴۰ء۔

مولانا شبلی کے لیے ترکی کا سفر اس لیے بھی پرکشش تھا کہ گزشتہ شاہانہ اسلامی شان وشوکت کی واحد یادگار یہی سلطنت رہ گئی تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے جاہ و جلال اور عظمت وشکوہ کی جو داستانیں کتابوں میں پڑھی ہیں ان کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر اپنی روح مضطرب کے لیے سرمایۂ نشاط حاصل کریں ؎

درموسم گل گر بہ گلستاں نرسیدیم　　از دست ندادیم تماشائے خزاں را

۱۸۸۳ء میں وہ علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے، یہاں کی آب و ہوا انکے مزاج کے موافق نہ تھی، چند برسوں کے بعد علالت کا سلسلہ شروع ہوگیا تو تبدیلِ آب و ہوا کے لیے کشمیر جانا چاہا، اسی اثنا میں ان کو خبر ہوئی کہ پروفیسر آرنلڈ ولایت جانے والے ہیں، مولانا شبلی علی گڑھ کے قیام میں ان سے ایسا گھل مل گئے تھے کہ اجنبیت اور بیگانگی ختم ہوگئی تھی، اس لیے دفعتاً ترکی کے سفر کا ارادہ قوی ہوگیا، لکھتے ہیں:

"مصر و روم کا سفر، آب و ہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کا ساتھ۔ اتفاق سے یہ سامان جمع ہوگئے ہیں، اس موقع کو ہرگز ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے"[2]

مسٹر آرنلڈ نے بھی خوشی ظاہر کی اور سفر کے ضروری کاموں میں مدد دینے کا وعدہ کیا مگر اس وقت جہاز کی روانگی کو صرف تین چار روز رہ گئے تھے، احباب و اعزہ نے سنا تو سخت متعجب ہوئے اور اکثروں نے سمجھایا کہ اس جلدی اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا بڑا لمبا سفر کون سی دانشمندی کی بات ہے، مگر مولانا کے عزم میں تزلزل نہیں پیدا ہوا

ع ہر چہ بادا باد من کشتی درآب انداختیم[3]

سفرنامہ لکھنے میں لیت ولعل ترکوں سے مولانا شبلی کو جس قدر شدید محبت تھی انگریزوں کو

۱؎ حیات شبلی: ص ۱۸۸ تا ۱۹۱ ۲؎ سفرنامہ روم و مصر و شام، ص ۹ و ۳؎ ایضاً: ص ۱۰۔

ان سے اسی قدر شدید نفرت تھی، اس لیے وہ ان کی کسی طرح کی مدح وتحسین کو پسند نہیں کر سکتے تھے، اسی بنا پر شروع میں چاہے مولانا کو خود یا سرسید احمد خاں کے ایما سے سفرنامہ لکھنے میں تامل و تردد ہوا، کیونکہ ترکوں کی محبت چاہے کتنی ہی قابل ستائش ہو مگر اس کا اظہار انگریزوں کی مخالفت و عداوت کا موجب ضرور ہوتا جو خلاف مصلحت تھا، اور باتوں سے قطع نظر اس کی وجہ سے کالج کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، مولانا سفرنامہ لکھنے میں اس لیے بھی متردد تھے کہ وہ اس طالب علمانہ اور خالص علمی و تعلیمی تحقیقات کے سفر کو نہ کوئی غیر معمولی امر خیال کرتے تھے اور نہ واقعات سفر میں انکے نزدیک چنداں ندرت تھی، مگر جب دوستوں کا اصرار بڑھا اور انہیں خود بھی یہ خیال ہوا کہ ایک مدت سے ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع نہیں حاصل ہوتی[1] تو وہ سفرنامہ لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔

سفرنامہ کی اہمیت اس کے مندرجات و مقاصد تصنیف و تالیف میں مولانا شبلی کا معیار بہت بلند تھا، ان کے خیال میں سفرنامہ میں جو خوبیاں اور خصوصیات ہونی چاہئیں ان سے انکا سفرنامہ خالی اور ان کے بلند معیار سے فروتر تھا، چنانچہ کہتے ہیں، اس میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی اجمالی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتدبہ واقعات ہیں اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں ہیں جس قدر ہونے چاہئیں[2]

۱؎ سفرنامہ روم و مصر و شام ص ۲ (تمہید)، ۲؎ ایضاً ص ۳ (تمہید)

لیکن ایک عام اور ناواقف شخص کے لیے مولانا کا سفر نامہ مختلف النوع معلومات کا خزانہ ہے، اس سے اس کے علم و واقفیت میں کافی حد تک اضافہ ہوتا ہے اور وہ مولانا کے علم و نظر کی وسعت اور مشاہدہ کی گہرائی کی طرح ان کی رعنائی بیان، حسن ادا، کتاب کی ترتیب و تالیف کی خوبی اور معلومات کو پیش کرنے کے ان کے خوبصورت انداز کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مولانا کے سفر کا خاص مقصد ان ملکوں کے کتب خانوں سے استفادہ اور ان کی معاشرت اور علمی حالت سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنا تھا جیسا کہ لکھتے ہیں:

> "اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہوسکتا تھا تو یہاں کی طرز تعلیم اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا، چنانچہ میں نے اس پر بہ نسبت اور باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہوسکا کوشش و محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔"[1]

چنانچہ یہ ساری باتیں نہایت تفصیل سے قلمبند کی ہیں، انہوں نے قسطنطنیہ، بیروت، قاہرہ اور ان کے ضمن میں متعدد دوسرے شہروں کے بارے میں وہ ساری باتیں لکھی ہیں جن سے ان ملکوں اور شہروں کی خصوصیات، علمی و تعلیمی ترقی، جدید و قدیم مدرسوں اور کالجوں کا حال، لوگوں کے اخلاق و عادات اور طرز معاشرت وغیرہ کا مرقع سامنے آگیا ہے، وہ جن شہروں میں گئے، یا جہاں سے گزرے ان کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے اور سفر کی ابتداء سے انتہا تک پیش آنے والا شاید ہی کوئی اہم اور

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۲۹

قابل ذکر واقعہ اور قارئین کی دلچسپی اور کشش کی کوئی بات چھوٹی ہو، جن ممتاز صاحب علم و ادب سے ان کی ملاقات ہوئی اس میں ان کا تذکرہ کرکے انہیں زندۂ جاوید بنادیا، شہروں کے بازاروں، ہوٹلوں، اہم عمارتوں، قدیم یادگاروں، مسجدوں، قابل دید جگہوں، عجائب خانوں اور تفریحی مقامات کا ذکر بھی کیا ہے اور سب سے زیادہ لطف و لذت کے ساتھ جدید و قدیم تعلیم گاہوں، کتب خانوں، مطابع اور اخبار اور رسالوں کا ذکر کیا ہے۔

سفرنامہ کا ایک اہم پہلو مولانا کے سفر کی یہ خوبیاں کم اہم نہیں ہیں، مگر ہم یہاں اس کے ایک اور اہم پہلو کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔

مصنف نے اپنے سفر کے جو اسباب اور سفر نامہ لکھنے کے جو مقاصد بتائے ہیں ان کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، لیکن ان کے سفر نامہ کا ایک اور مقصد تھا جس کی صراحت تمہید میں موجود ہے، یہاں اسی پہلو کی وضاحت مقصود ہے۔

اہل نظر اس سے پوری طرح واقف ہیں کہ مولانا شبلی کو سب سے زیادہ یورپ کی چیرہ دستیوں کا شکوہ رہا ہے، کیونکہ یورپ نے مسلمانوں کے کارناموں کو محو کرنے، ان کی تاریخ کو مسخ کرنے اور اسے بدنما شکل میں پیش کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا ہے، اس کے اہل قلم اور مصنفین، اسلام، تاریخ اسلام، سلاطین اسلام اور مسلمانوں کے علوم و فنون کی طرح طرح کی برائیاں لوگوں میں پھیلا رہے تھے تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنی تاریخ پر فخر کرنے کے بجائے اس سے نفرت کرنے لگے، مولانا شبلی کی اکثر کتابیں یورپ کی انہی ہرزہ سرائیوں کا جواب ہیں، جن کی تالیف کا مقصد یورپ کے لگائے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے داغ دھبوں کو

مٹایا ہے؛ چنانچہ ان کی چشم بینا سے وہ شرانگیزی اور فتنہ سامانی بھی اوجھل نہیں رہ سکی جو یورپ نے ترکوں کے معاملے میں کی تھی، وہ کہتے ہیں کہ یوروپین لٹریچر پڑھ کر ترکوں کی نسبت تحقیر کے خیالات نہ پیدا ہونا بعینہ ایسا ہے جیسا خواب آور دوا کھا کر نیند نہ آنا، انہوں نے ترکوں اور عربوں نیز دوسرے مسلمانوں کی جو بھونڈی تصویر کھینچی ہے اس سے مولانا مضطرب اور بے چین ہو گئے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے سفرنامہ میں یہی دکھایا اور بتایا ہے کہ یہ ترکوں کی اصل تصویر نہیں ہے، لکھتے ہیں:

"میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے کچھ بحث نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی بحث میرے منصب وحالت کے لحاظ سے مناسب تھی تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے"[1]

مولانا نے سفرنامہ کی تمہید میں دور حاضر میں یورپ کی ناوک افگنی کی یہ مخصوص صورت بتائی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہاں جب سے مذہب کا زور گھٹا تو اس نے مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھنے کے بجائے یہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قوموں، اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرایہ میں ظاہر کیے جاتے ہیں اور عام تصنیفات، قصوں، ناولوں، ضرب المثلوں کے ذریعہ سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے[2] مولانا نے خصوصیت سے ترکوں کی تصویر بگاڑنے کی حسب ذیل صورتوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ یورپ میں مصنفین کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان میں متعصب، نیک دل، ظاہر بیں،

---

[1] سفرنامہ روم ومصر وشام ص۳ (تمہید) [2] ایضاً

دقیق النظر ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگ ہیں، لیکن ترکوں کے ذکر میں وہ اختلاف مدارج زائل ہو جاتا ہے اور ہر ساز سے وہی ایک صدا نکلتی ہے، مثلاً آج کل سچے سے سچے یوروپین مصنفین کی راست بیانی یہ ہے کہ وہ ترکی حکومت کے ذکر میں قرضہ کی گرانباری، صنائع وفنون کا بقدر کافی موجود نہ ہونا، اضلاع میں تعلیم کی عدم وسعت، آلات واسلحہ میں یورپ کی احتیاج۔ کو بالکل راست راست لکھتا ہے، لیکن جو اصلاحیں حال میں ہوئی ہیں ان کے ذکر سے دامن بچا جاتا ہے کہ گویا اصلاح کا سرے سے وجود ہی نہیں[1] خزانہ کا انتظام، تمام اضلاع میں زراعتی بنکوں کا قائم ہونا اور مدارس رشدیہ کی تعداد کا ۹۶ سے ۵۰۴ تک ترقی کر جانا، بڑے بڑے کالجوں کا جاری ہونا [illegible] وسعت، ادائے قرضہ کے انتظامات، فوجی قوت کی ترقی۔ ان واقعات کو بھول کر نہیں لکھتا۔

۲۔ کسی قوم یا کسی شخص کے قابل مدح یا ذم ثابت کرنے کا یہ نہایت آسان طریقہ ہے کہ اس کے حالات اور واقعات کی یک رخی تصویر کھینچی جائے اور انصاف یہ ہے کہ یورپ نے اس فریب آمیز طریقہ کو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ برتا ہے[2]

۳۔ یورپ کے وہ فیاض دل جن کو تعصب سے کچھ واسطہ نہیں لیکن بچپن سے جس قسم کے خیالات میں انہوں نے پرورش پائی، ان کے گرد وپیش معلومات کا جو سرمایہ ہے، ان چیزوں کے مقابلے میں ان کی بے تعصبی بھی کچھ کام نہیں دیتی، چنانچہ ایک بے تعصب اور عام شخص سے جو قسطنطنیہ ومصر وغیرہ سے واپس آئے تھے مولانا نے برسبیل تذکرہ پوچھا کہ آپ نے جامع ازہر کی سیر بھی کی تو وہ بولے مجھ کو اس کی سیر کا بہت شوق تھا لیکن میرے رہنما نے کہا کہ عیسائیوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے، اگرچہ

---

[1] سفرنامہ روم ومصر وشام (تمہید) ص۴ [2] ایضاً۔

واقعہ محض غلط ہے مولانا خود جامع ازہر میں ایک مہینہ سے زیادہ مقیم رہے اور ان کے عیسائی احباب بے تکلف مسجد ہی میں ان سے ملنے آتے تھے، لیکن چونکہ یورپ میں مسلمانوں کا تعصب اور تنگ خیالی علوم متعارفہ کے قریب ہے ان صاحب کو اپنے رہنما کی بات کے یقین کرنے میں کیونکر تامل ہو سکتا تھا، طرہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے عام شاہراہ سے الگ ہو کر کچھ کہا یا لکھا تو یورپ کے نقار خانے میں اس کی آواز طوطی کی آواز سمجھی جاتی ہے۔

ایک انگلش شہزادی نے پندرہ سولہ برس قسطنطنیہ میں رہ کر دوازدہ سالہ حکومت عبدالحمید ثانی کے نام سے جو کتاب لکھی اگرچہ اس کے اعتبار کے لیے مصنفہ کی علمی قابلیت، پندرہ سولہ برس کا تجربہ، دریافتِ حالات کے صحیح وسائل یہ تمام قرائن موجود تھے لیکن چونکہ وہ ترکوں کی عیب گوئی میں یورپ کی ہم زبان نہ تھی اس کو استناد اور اعتماد کا درجہ نہ حاصل ہو سکا، مولانا نے تعلیم یافتہ اشخاص کو اس کی نسبت یہ کہتے سنا کہ "عجب نہیں یہ کتاب فرضی مصنف کے نام سے خود ترکوں نے لکھی ہو یا اس انگلش شہزادی کو سلطانی انعامات نے ایسی کتاب لکھنے پر مجبور کیا ہو" لیکن بقول مولانا یہی کتاب اگر ترکوں کے مخالف میں ہوتی تو ان اشخاص کے نزدیک اسکا ہر حرف قطعی و یقینی ہوتا[1]

۴۔ مولانا نے خاص سفرنامے لکھنے والوں کی ایک بڑی اور عام غلطی یہ بتائی ہے کہ وہ جزئیات سے کلیات قائم کرتے ہیں، سفر میں انسان کو جن اشخاص سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان کے اخلاق، عادات، خیالات سے تمام قوم کی نسبت عام رائے قائم کر لیتے ہیں حالانکہ ممکن ہے کہ وہ امور انہیں چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں اسی طرح ہر واقعہ سے وہ ایک عام نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں اور واقعہ کے خاص اسباب کی جستجو

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام : ص ۵۔

نہیں کرتے (ص ۶ (تمہید))

۵۔ غلطی کا ایک بڑا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ جو شخص کسی ملک کا سفر کرتا ہے اس کی نسبت پہلے سے اس کے خیالات دوستانہ یا مخالفانہ ہوتے ہیں، وہاں پہنچ کر اول اول جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے وہ محض سرسری ہوتا ہے اور چونکہ ایسی اجمالی واقفیت استنباطِ نتائج کے لیے کافی نہیں ہوتی اور وہ نتیجہ کے قائم کرنے میں دیر تک انتظار نہیں کر سکتا اس لیے وہ ہر واقعہ کے ساتھ قیاسات کو دخل دیتا جاتا ہے، ان قیاسات کے وقت وہ حسن ظن یا سوئے ظن جو پہلے سے اس کے دل میں موجود تھا چپکے چپکے اپنا کام کرتا ہے اور اس کو خبر تک نہیں ہوتی، اس قسم کی غلطی اگرچہ دنیا کی تمام قوموں سے متعلق ہے لیکن یورپ والوں کو اس میں ایک خاص ترجیح حاصل ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ استنباطِ نتائج میں یورپ والوں کو جو بے صبری ہے وہ کسی قوم کو نہیں۔ (ص ۷ (تمہید))

۶۔ ایک نکتہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ سیاح کو چونکہ حالات کے دریافت کا نہایت شوق ہوتا ہے اس لیے وہ ہر شخص سے جو اس کو مل جاتا ہے کچھ نہ کچھ معلومات کا سرمایہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس تعمیم میں وہ ان تحقیقات کی کہ وہ شخص ثقہ ہے یا غیر ثقہ، روشن ضمیر ہے یا متعصب، دقیق النظر ہے یا ظاہر بین کچھ پروا نہیں کرتا اور کرنا بھی چاہے تو کامیابی نہیں ہو سکتی، یورپ والے اس باب میں اور بھی بے احتیاط ہیں، قسطنطنیہ کا سفر کرنے والے معمولاً ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں اور جہاں کہیں جانا چاہتے ہیں ایک گائڈ ان کے ساتھ ہوتا ہے جو نہ صرف انکو عمارات اور مقدس مقامات کی سیر کراتا ہے بلکہ ان کے تمام سوالات کا جو موقع بموقع وہ پوچھتے جاتے ہیں جواب دیتا جاتا ہے، یہ گائڈ عموماً عیسائی ہوتے ہیں اور روپیہ دو روپیہ روز آنہ ان کی اجرت ہوتی ہے،

ان کاتبوں کی معلومات جس قسم کی ہو سکتی ہیں، ہر شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔" (تمہید)

ان اسباب کی بنا پر انھوں نے لکھا ہے کہ "غرض یورپ کی تحریروں اور سفرناموں سے ۔ میرے سفرنامہ کا مختلف ہونا لازمی بات تھی۔"

یورپ نے ترکوں، عربوں اور عام مسلمانوں کی جو تصویر کھینچی ہے، مولانا نے اپنے سفرنامہ میں اسے اس سے مختلف بتایا ہے، اس لیے اس میں ترک و عرب کی وہ خوبیاں نمایاں کی ہیں، جن کو یورپ والوں نے عمداً اس لیے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان کی تصویر بہت بدنما دکھائی دے، مولانا نے بھی ان کے عیوب سے یکسر چشم پوشی نہیں کی ہے، البتہ اگر ان کی توجیہ ممکن ہو سکی ہے تو وہ ضرور کی ہے، اس طرح ان کی کتاب یک رخی نہیں ہے بلکہ اس میں محاسن و معائب دونوں دکھائے گئے ہیں۔

ترکوں کی جو تصویر مولانا کے سفرنامہ سے ابھرتی ہے اس کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس درد کا ذکر کر دیا جائے جو انہیں عربوں، ترکوں اور عام مسلمانوں سے تھا۔

مولانا شبلی کا قومی و ملی درد

مولانا شبلی کے دل میں قومی درد اور ملی حمیت کا ایک طوفان امنڈ رہا تھا جس نے انہیں ترکوں اور عربوں کے اصلی خط و خال اجاگر کرنے اور یورپ کی غلط بیانی کی تردید لکھنے پر آمادہ کیا تھا، اس لیے پہلے اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

عام مسلمانوں سے مولانا کی دلچسپی اور ہمدردی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جہاز کا ان کا سفر بمبئی سے شروع ہوا تھا وہاں سے پورٹ سعید تک انہیں کوئی مسلمان دکھائی نہ دیا، یہاں پہنچ کر جب کچھ مسلمان نظر آئے تو انہیں بڑی خوشی ہوئی اور آگے بیروت کا منظر یہ تھا "بیروت میں تو سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا، بدقسمتی سے فرسٹ اور

سیکنڈ کلاس کو تو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی، لیکن تیسرے درجے میں ہر طرف مسلمان ہی مسلمان تھے، میں شروع سفر سے مسلمانوں کی صورت کو ترس گیا تھا، یہ مجمع دیکھ کر حد سے زیادہ خوشی ہوئی۔" (ص۳)

مولانا شبلی کو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی ترقی سے خاص دلچسپی تھی اس لیے وہ اسلاف کے شاندار کارناموں اور ان کی شکوہ و عظمت سے معمور داستان سناتے اور دہراتے تھے تاکہ موجودہ دور کے مسلمانوں کو عبرت اور اپنے حال و مستقبل کو سنوارنے اور بنانے کا ولولہ پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دور کے مسلمانوں کی نسبت سے جب کوئی اچھی خبر سنتے یا ان کی خوش حالی سے واقف ہوتے تو باغ باغ ہو جاتے اور جب کوئی بری خبر سنتے یا انہیں برے حال میں دیکھتے تو نہایت رنجیدہ اور مغموم ہو جاتے۔

۷ رمئی ۱۸۹۲ء کو ان کا جہاز عدن پہنچا تو وہاں سمالی قوم کے بہت سے لڑکوں کو دیکھ کر جنھیں وہ عرب سمجھتے تھے بڑا دکھ ہوا، یہ لڑکے جہاز والوں سے انعام لینے کے لیے عجیب عجیب مبتذل حرکتیں کرتے تھے، کچھ ناچتے گاتے، کچھ آپس میں مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے اور بغلیں بجاتے جاتے، بڑا کمال یہ کہ لوگ دوانی چونی پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے، سمندر میں پھینک دیتے اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے۔ اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور آرنلڈ کو بھی اس میں مزہ آتا تھا، لیکن مولانا کی کچھ اور حالت تھی اور ان کا دردمند دل یہ منظر دیکھ کر بے تاب ہو رہا تھا کہ عرب جو کبھی دنیا کے فاتح اور کشورکشا تھے آج اپنے حریفوں کے سامنے مسخرہ پن کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"عبرت ہوتی تھی کہ عرب کی اب یہ حالت ہے کہ غیروں کے سامنے اس قسم کی حرکت سے ان کو شرم نہیں آتی، ان خیالات سے بے اختیار میرا دل بھر آتا تھا یہاں تک کہ

آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بے اختیار زبان سے نکلا قم یا عمر۔ آرنلڈ پاس تھے میری تغیر حالت پر ان کو خیال ہوا، میں نے دل کی کیفیت اور اسکا سبب بیان کیا۔" (ص ۱۳، ۱۴)

شہر جا کر جب تحقیق سے ثابت ہوا کہ سمالی قوم عرب نہیں ہے تو ان کو کسی قدر تسکین ہوئی۔ پورٹ سعید میں جب کوئی بلند اور شاندار عمارت دیکھتے تو اس خیال سے خوش ہوتے کہ الحمد للہ ان ملکوں میں مسلمان خوش حال اور دولت مند ہیں، لیکن جب دریافت کرنے سے یہ معلوم ہوتا کہ کسی یورپین سوداگر کا مکان ہے تو ان کی ساری خوشی ختم ہو جاتی، کتنی حسرت سے لکھتے ہیں:

"سارے شہر میں ایک بھی عمدہ مکان یا بلند عمارت کسی مسلمان کی نہ تھی، افسوس
ع بہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیداست۔" (ص ۱۹)

مولانا کو مسرت اس وقت ہوتی ہے جب مسلمانوں کو بہتر حال یا علم و ہنر میں ترقی کرتا ہوا دیکھتے ہیں، چنانچہ قسطنطنیہ میں جہازوں کے بنانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ دیکھا تو جھوم اٹھے، لکھتے ہیں:

"نہایت قابل تعریف بات یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان کارخانہ صرف ترک چلاتے ہیں، تمام افسر اور کاریگر اور ملازم ترک ہیں، صرف ایک یورپین معمولی درجے کا ملازم ہے اور وہ بھی قدامت کے لحاظ سے بحال رکھا گیا ہے، انجن بھی یہاں تیار ہوتے ہیں اور ترکوں کا بیان ہے کہ یورپ کے بنے ہوئے انجنوں سے کسی بات میں کم نہیں ہوتے، ایک افسر نے مجھ سے کہا کہ اس قسم کے تمام کاموں میں ہم کو یورپ کی احتیاج نہیں رہی۔" (ص ۱۰۵ و ۱۰۶)

اس کے مقابلے میں انھی ترکوں اور عام مسلمانوں کی زندگی کے بدنما اور خراب پہلو جب ان کے سامنے آتے ہیں تو وہ سخت کبیدہ خاطر اور نہایت متاسف ہو جاتے ہیں، قسطنطنیہ کی خانقاہوں اور زاویوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا ذکر کتنے پُر درد انداز سے کیا ہے:

"تم نے عربی تاریخوں میں پڑھا ہوگا کہ تمام ممالک اسلامی میں سیاحوں اور طالب علموں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا وہ انھیں خانقاہوں اور زاویوں کی بدولت تھا، ابن بطوطہ کو اپنے عالمگیر سفر میں اسی طریقہ کی وجہ سے مدد ملی تھی، چنانچہ اس نے سفرنامے میں ان زاویوں کو نام بہ نام لکھا ہے، لیکن یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی قوم کے برے دن آتے ہیں تو مفید تدبیریں مضر بن جاتی ہیں۔ مسلمانوں کو سیر و سیاحت، جغرافیانہ تحقیقات، تحصیل علم کا مذاق تو جاتا رہا اسلئے اب یہ طریقہ کاہلی، مفت خوری، دریوزہ گری کا ایک ذریعہ رہ گیا ہے اور قومی زندگی کو نہایت نقصان پہنچا رہا ہے، میں نے اکثر خانقاہوں میں خود جا کر دیکھا کئی کئی برس کے آئے ہوئے مسافر پڑے ہیں، نہ کسی قسم کا شغل ہے، نہ کچھ کام ہے، لکھنؤ کے تکیوں کا جو حال سنا کرتے تھے، یہاں آنکھوں سے نظر آتا ہے، شیوخ جن کو خانقاہ کا انتظام سپرد ہوتا ہے اور تمام نقد و جنس ان کے اہتمام میں رہتی ہے، عموماً خائن اور بد دیانت ہیں، خود نہایت آرام و عیش سے بسر کرتے ہیں اور مسافروں کے لیے جو مقدار مقرر ہے، اس کا آدھا، تہائی، چوتھائی بھی انکو نہیں دیتے ... خانقاہ کی عمارت جابجا سے ڈھے چلی ہے، صحن میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا رہتا ہے، مختصر یہ کہ وحشت اور ویرانی کی پوری تصویر ہے، میں نے اور جن خانقاہوں کو دیکھا وہ اگرچہ ہندی خانقاہ سے ہر بات میں بہتر تھیں، لیکن دیانت اور راست بازی کا

پتہ کہیں نہیں ملتا، اسی طرح کئی لاکھ سالانہ کی رقم نہایت بری طرح برباد ہوتی ہے[1]"

امانت و دیانت کے معاملے میں مولانا بڑے حساس تھے، بد دیانتی اور خیانت ان کے لیے ناقابل برداشت تھی، مسجد اقصیٰ کو ناہموار اور غیر مسطح پایا اور اکثر جگہ خودرو گھاس اور جھاڑیاں دیکھیں تو لوگوں سے اس کا سبب دریافت کیا، معلوم ہوا کہ سلطان نے کئی دفعہ مرمت اور درستی کے لیے رقم کثیر بھیجی لیکن کارپردازوں اور مجاوروں نے اس کا بہت کم حصہ صرف کیا، طرہ یہ کہ انہوں نے خود مجاوروں سے پوچھا تو ایک صاحب نے فرمایا کہ "ہاں کچھ رقم مجاوروں کے تصرف میں بھی آتی ہے اور کیوں نہ آئے باورچی کھانا پکاتا ہے تو نمک خواہ مخواہ چکھ لیتا ہے" (ص ۱۰۱)

اس کے برخلاف جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو دیانت اور راست بازی کا نمونہ ہوتے ہیں تو بے اختیار ان کی ستایش کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں، قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے تذکرے میں لکھتے ہیں :

" چونکہ تمام اوقاف کا انتظام حکومت سے متعلق ہے، کتب خانے بھی گورنمنٹ کے زیر اہتمام ہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجود امتداد زمانہ کے کتابیں اس احتیاط سے محفوظ ہیں کہ ایک پرچہ بھی ضایع نہیں ہونے پایا ہے، ملازمین باوجود قلت تنخواہ کے نہایت متدین اور راست کردار ہیں، کتب خانہ عاشر آفندی کا وقف اس قدر کم ہے کہ لائبریرین کو معمولی خوراک اور ۲ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے لیکن جو شخص لائبریرین مقرر کیا گیا ہے، اس قدر دیانت دار اور اپنے فرائض کا پابند ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں۔ کتب خانہ کی دیواروں پر

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام : ص ۱۰۰، ۱۰۱۔

انگور کی بیلیں چڑھی ہیں، ایک دن میں نے اس سے کہا کہ اگر تم انگوروں کو بیچ ڈالو تو تم کو معقول آمدنی ہو سکتی ہے، بولا کہ وقف کی شرط کے مطابق انگور صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو کتب خانہ میں کتاب پڑھنے کی غرض سے آئیں، اس لیے میں ان سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، قلت تنخواہ کی وجہ سے بیچارے نے شادی بھی نہیں کی ہے، نہ رہنے کا مکان ہے، کتب خانہ ہی میں رات کو پڑ رہتا ہے" (ص ۹۰)

مولانا جب عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں اور ترکوں کے خراب حالات دیکھتے تھے تو انہیں خاص طور پر نہایت تکلیف ہوتی تھی اور وہ اس صورت حال کا دردانگیز انداز میں ذکر کرتے ہیں، مسلمانوں کو غیرت دلاتے ہیں اور عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں، چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور علمی ترقی میں عیسائیوں کے ان سے بہت آگے ہو جانے کا انہیں کس قدر غم ہوتا تھا :

" لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ یہ تمام علمی ترقی اور تصنیف و تالیف جو کچھ ہے، عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے، مسلمان ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے ہیں" (ص ۸۵)

قسطنطنیہ کی تعلیم گاہ سمیت مکتب سلطانی کے اونچے درجوں میں ترک مسلمانوں کا تناسب عیسائیوں کے مقابلے میں نہایت کم دیکھ کر اپنا افسوس ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :

" یہ افسوس ہے کہ اعلیٰ کلاسوں میں تعلیم پانے والے زیادہ تر عیسائی ہیں، مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ شیخ عبد الفتاح آفندی نے مجھ کو سال رواں کی رپورٹ نتیجہ امتحان عنایت کی تھی، اس میں جس قدر اعلیٰ درجے کے امتحانات پاس کرنے والے ہیں اکثر عیسائی ہیں" (ص ۸۲)

ایک جگہ لکھتے ہیں :

"سیحیان طالب علموں کی یہ تعداد گو فی نفسہ کم ہے لیکن یہ امر اور بھی زیادہ افسوس کے قابل ہے کہ اس تعداد میں زیادہ تر ادنیٰ درجے کے تعلیم والے شامل ہیں ورنہ اعلیٰ تعلیم کے لحاظ سے ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یہ شہر اسلامی حکومت کا مرکز اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں یہاں حاکم و محکوم کی نسبت ہے تاہم تہذیب و تمدن میں مسلمانوں کو عیسائیوں سے کچھ نسبت نہیں، تعلیم کی جو حالت ہے وہ نقشہ بالا سے معلوم ہوئی ہوگی، تصنیف و تالیف کا حال اوپر گزر چکا ہے، اخبارات، مطابع، تجارت وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ بدتر حالت ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار" (ص۱۵۴)

چھاپہ خانوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"یہ افسوس کی بات ہے کہ یہاں کوئی مطبع اتنا وسیع اور اس قدر دولت مند نہیں جیسا کہ ہندوستان میں نولکشوری مطبع ہے، اس کے ساتھ یہ اور افسوس ہے کہ اکثر مطابع غیر قوموں کے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تمام قسطنطنیہ میں مسلمانوں کا بھی (شرکت صحافیہ) مشترک کارخانہ ہے ورنہ مسلمان اولاً تجارت کو ہاتھ ہی کیوں لگاتے اور کسی اتفاقی وجہ سے اس کام کو کرتے بھی تو دو چار شخص مل کر کیوں کرتے، اس لحاظ سے یہ مطبع یک گونہ خرق عادت میں داخل ہے"۔ (ص ۸۸ و ۸۹)

بیروت کی انجمنیں اور جمعیات سب عیسائیوں کی تھیں، مولانا رقمطراز ہیں:

"انجمنیں یہاں کثرت سے ہیں اور ان کے مقاصد نہایت مفید ہیں، لیکن تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بھی نہیں"۔ (ص۱۶۱)

انجمنوں کی فہرست دیکر ظاہر کیا ہے کہ عیسائی مذہب کی جس قدر شاخیں ہیں سب کی

الگ الگ انجمنیں ہیں، لیکن مسلمانوں نے اس "فضول کام" کو سرے سے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ (ص۱۶۲)

لیکن اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ عیسائیوں کی تعلیمی ترقی سے رنجیدہ اور ان سے نفرت و عناد رکھتے تھے بلکہ دراصل انہیں مسلمانوں کی علمی و تعلیمی پسماندگی کا غم تھا، وہ عیسائیوں کی علمی خدمت و ترقی کا ذکر فراخ دلی اور تحسین کے ساتھ کرتے ہیں:

"مجھ کو خدانخواستہ عیسائیوں کی ترقی پر حسد نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے تنزل کا رنج ضرور ہے"۔ (ص۴۲)

اموی دور کے مشہور نصرانی شاعر اخطل کے نایاب اور عزیز الوجود دیوان کا ایک نسخہ صرف شہنشاہ روس کے کتب خانہ میں موجود تھا، جس کی نقل و کتابت اور تصحیح ہو چکی تھی اسے دیکھا تو لکھتے ہیں:

"میں نے ان عیسائیوں کی بلند ہمتی اور ذوق علمی کا دل سے اعتراف کیا، مسلمانو! تم کو بھی کچھ غیرت آتی ہے ۔ ۔ ۔ تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان عالموں نے ادب میں جو مفید کتابیں لکھی ہیں وہ بھی انہیں عیسائیوں کی بدولت یعنی عیسائیوں نے ان کو اجرت اور صلہ دے کر یہ کتابیں تصنیف کرائیں اور انکو اپنے اہتمام سے چھاپا اور شایع کیا، مقامات بدیعی اور رسائل بدیعی کی شرحیں جو حال میں نہایت خوبی اور اہتمام سے چھپ کر شایع ہوئیں، اسی طریقے سے تیار ہوئی ہیں"۔ (ص۵۱)

اس صورت حال کو وہ افسوسناک اور شرمناک قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"افسوس اور شرم کی بات ہے کہ کتب خانہ خدیویہ کی نادر کتابیں یورپ جاکر چھپتی ہیں اور وہاں سے شایع ہوتی ہیں، سید عبدالواحد طوبے ایک مشہور تاجر ہیں، یورپ والوں

نے ان سے معاملہ کر رکھا ہے وہ ان کے حسب فرمائش کتابوں کی نقل لکھوا کر یورپ کو بھیجتے ہیں چنانچہ سید عبدالواحد نے مجھ کو تین چار کتابوں کے قلمی اجزا، دکھلائے جو انھوں نے یورپ بھیجنے کے لیے نقل کرائے تھے" (ص۲۱۵)

بیروت کے ایک اہم کالج کو دیکھ کر بھی ان پر یہی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ :

"حقیقت یہ ہے کہ یہ کالج یہاں کے عیسائیوں کے لیے باعث فخر اور تمام مسلمانوں کیلئے موجب رشک ہے، مصر و شام کا تو کیا ذکر ہے قسطنطنیہ کا بھی کوئی کالج اس کی ہمسری کا دعوی نہیں کر سکتا" (ص۱۵۷)

مصریوں اور ترکوں کی خراب تصویر

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ مولانا شبلی قوم و ملت کے درد سے کس قدر بے قرار اور بے چین رہتے تھے، اب آئیے دیکھیں کہ انھوں نے ترکوں اور عربوں کی کیا تصویر کھینچی ہے، ان کی تصویر کے دونوں رُخ ہیں، پہلے ہم خراب رُخ کا ذکر کرتے ہیں :

مولانا کو ترک اور عرب ملکوں میں تعلیم خصوصاً قدیم تعلیم کی خراب صورت کا بہت غم تھا، وہ اس کے نصاب و نظام تعلیم اور معیار کی پستی کا جابجا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ قدیم تعلیم بلاشبہ کسی زمانے میں اعلیٰ درجے پر تھی لیکن موجودہ تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی تعلیم ان کو غنیمت معلوم ہوتی تھی، سفر میں جس چیز کا تصور ان کی ساری خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی، ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے، لیکن قسطنطنیہ، شام، مصر میں یہ حالت

دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا، وہ نئی تعلیم کو دل سے پسند کرتے تھے، مگر مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لیے قدیم تعلیم کو ضروری بتاتے تھے، لیکن یہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے اسے بالکل بے سود اور بے معنی سمجھتے تھے اور اس سے ان کو بڑا رنج ہوتا تھا (ص۸۰و۸۱)

وہ مسلمانوں کی علمی بدمذاقی اور عامیانہ اور سطحی کتابوں اور پست درجہ کے لٹریچر کے دلدادہ ہو جانے سے سخت نالاں تھے۔ فرماتے ہیں :

"البتہ یہ افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ملک کے مذاق کے خراب ہو جانے کی وجہ سے عمدہ اور نادر المضمون کتابیں کم چھپتی ہیں، کتب خانہ خدیویہ میں جو نایاب قلمی کتابیں موجود ہیں ان میں سے اگر سو دو سو کتابیں بھی چھاپ دی جائیں تو دنیا معلومات مفیدہ سے مالامال ہو جائے، میں نے بعض روشن ضمیر مطبع والوں سے اس باب میں گفتگو کی، انھوں نے جواب دیا کہ اس قسم کی کتابیں عام پسند نہیں۔ عام پسند کتابیں البتہ بار بار چھپتی ہیں اور بک جاتی ہیں، مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف جو آٹھ برس سے پہلے چھپی تھی۔ اس کی جلدیں آج تک نہیں نکلیں"[1]

ترکی کے تمام کالج اور دارالعلوم حکومت کے رہین منت ہیں خود انھوں نے اپنی کاہلی اور تن آسانی سے تعلیم کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینے اور قومی اسکول و کالج قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہ صورت بھی مولانا شبلی کے اضطراب و خلجان کو بڑھا دیتی ہے اور وہ یہ لکھتے ہیں :

"اس سے بڑھ کر یہ افسوس ہے کہ قسطنطنیہ کے تمام کالج اور دارالعلوم جن کا میں نے

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام : ص ۲۱۔

ذکر کیا حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس طرف کچھ توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دار السلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گو کیسی ہی مقتدر اور دولت مند ہو لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں، جس قوم کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے، اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بیکار ہو جاتی ہیں۔ یورپ میں جو عظیم الشان علمی کارخانے پھیلے ہوئے ہیں، ان میں زیادہ تر قوم کا حصہ ہے"[1]

علم کی طرح تجارت اور صنعت و حرفت سے ترک مسلمانوں کی کنارہ کشی اور اچھے مکانات اور ہوٹل کا مالک نہ ہونے پر بھی بار بار اظہار افسوس کیا ہے۔

ترکی کے متعلق مولانا نے اپنے تاثر کا نچوڑ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے انکو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں، کرتے نہیں، ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے کل قوم پر من حیث الاغلب افسردگی سی چھائی ہوئی ہے، جو شخص جس حال میں ہے اسی پر قانع ہے، موجودہ حالت تو یہ ہے وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا"، ص ۳ (تمہید)

(باقی)

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۶۲۔

شہر بریلی کے تاریخی کتبات

از

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب۔ بریلی

کتبہ کی یہ تعریف ہو سکتی ہے کہ وہ ایسی عبارت ہے جو کسی سخت چیز پر کندہ کی جاتی ہے۔ یہ عبارت نثر اور نظم دونوں میں ہو سکتی ہے۔ کتبہ ایک طرح کا سرکاری یا غیر سرکاری عوامی نوعیت کا اشتہار ہوتا ہے جس کا مقصد متعلقہ اطلاع کو پائیدار ریکارڈ کی شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ کتبوں سے کسی عہد کی تاریخ کو دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے اور اس عہد کی جو روایات آثار مسکوکات اور دیگر شہادتیں بدست ہوتی ہیں ان کو کتبوں کی روشنی میں جانچنے اور تاریخی حقائق کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے[1]۔

بریلی کی تاریخ کافی قدیم ہے۔ اہی چھترا اور رام نگر کے آثار کی روشنی میں بریلی کا تعلق پانچال (۳۰۰۰ سال قبل مسیح) سے قائم ہوتا ہے[2]۔ دور قدیم کے سنسکرت زبان میں کتبے اہی چھترا اور رام نگر میں ہی برآمد ہوئے۔ یہ دونوں مقامات ضلع بریلی کی تحصیل آنولہ میں واقع ہیں۔ ایک قدیم کتبہ بریلی کے شمال مشرق میں موضع ڈیورنیاں کے مندر میں دستیاب ہوا تھا[3] گیارہویں صدی عیسوی میں پانچال کا زوال ہو گیا۔ شمالی ہندوستان ۱۲۰۳ء میں غوریوں کے زیر اقتدار آ گیا۔ ۱۵۲۶ء میں بابر کی فتح ہندوستان کے وقت شمالی ہندوستان میں بدایوں سیاسی و علمی اقتدار کا مرکز تھا۔ اس وقت بریلی میں گھنا جنگل

تھا جس میں اہیر آباد تھے اور بریلی کا نام پٹہ اہیران تھا، ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملۂ تیمور کے بعد کٹھیر یا راجپوتوں کو عروج ملا جس کے زیر اثر بریلی کا نام پٹہ اہیران کی جگہ کٹھیر پڑ گیا۔[۱] اس عہد کے سیاسی حالات کا علم تو ہوتا ہے لیکن عمارتوں اور کتبوں کے آثار نہیں ملتے۔ جب اکبر کے عہد حکومت میں بریلی پر مغلوں کا قبضہ ہوا اور عمارتوں کی بنا رکھی گئی، کتبات کا رواج پڑا اور یہ سلسلہ آیندہ بھی جاری رہا۔

اس مضمون میں شہر بریلی کے عربی فارسی اور اردو کتبات کو ان کے تاریخی پس منظر میں متعارف کیا گیا ہے۔ یہ کام اس وجہ سے بھی ضروری معلوم ہوا کہ محکمہ آثار قدیمہ نے شہر بریلی کے صرف پانچ کتبات کو پیش کیا ہے، درقبل اس کے کہ کتبات ضائع ہو جائیں ان میں سے اہم کتبات کو متعارف کرانا خالی از افادہ نہیں ہے۔

مقبرۂ شاہ دانا ولیؒ | ہندوستان پر مسلمانوں کے عہد حکومت کے وقت تاریخ بریلی کے زمانی تسلسل میں مقبرہ شاہ دانا ولیؒ ایک قدیم عمارت ہے۔ حضرت شاہ دانا ولیؒ کے حالات ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ ان کا مقبرہ بریلی سے پیلی بھیت جانے والی پختہ سڑک کے مغربی کنارے پر شہر کہنہ میں واقع ہے، جہاں زائرین کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ اس مقبرے کے دالان کی مشرقی راہداری کے بالائی پتھر پر خط نستعلیق میں مندرجہ ذیل نوشتہ ملتا ہے:

۷۸۶

مزار اقدس قطب بریلی

قبلہ حضرت شاہ دانا ولی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سید جلال الدین احمد عرف دانا میاں

تاریخ وصال ۷۳۱ھ

۷۳۱ ہجری مطابق ۱۳۳۰-۱۳۳۱ عیسوی۔ دور حکومت محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء)

کتبہ جدید اور کاتب کم سواد۔ شاید یہ کتبہ کسی پرانے کتبے یا دستاویز سے نقل کیا گیا ہے

اس مقبرے میں دوسرا کتبہ کمرۂ قبر کے مشرقی دروازے کی چوکھٹ پر لگی ہوئی پیتل کی چادر پر کندہ کیا گیا ہے، جس کی عبارت مندرجۂ ذیل ہے:

مزار اقدس سید جلال الدین احمد عرف شاہ دانا ولی

یہ کتبہ جدید اور تاریخ سے عاری ہے۔

اس مقبرے میں ایک وصلی خط طغرا میں قبر کے سرہانے بائیں جانب جنگلہ (RAILING) میں آویزاں ہے جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

وکفی باللہ شہیدا

محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم

۱۲۱۷ ہجری مطابق ۱۸۰۲-۱۸۰۳ عیسوی۔ تخت دہلی پر شاہ عالم (م ۱۸۰۶ء) بریلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت۔ یہ ایک خوشنما کتبہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی معتقد نے اس کو بطور زینت آویزاں کیا تھا۔

ایک کتبہ اسی مقبرے کی چہار دیواری کے مغربی دروازے کے دائیں جانب تاج مسجد کی دیوار کے متصل قاضی اسد اللہؒ کی قبر کے سرہانے پتھر پر کندہ کیا گیا ہے، جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

ھوالمجید

۷۸۶

مزار مبارک

سیدنا مولانا حضرت قاضی اسد اللہ قادری سجادہ نشین نیوتنی شریف

مرید و خلیفہ

حضرت سیدنا و مولانا شاہ عبد المجید قادری بدایونی

تاریخ وصال ۱۲ صفر ۱۲۷۲ھ ہجری

خادم شکیل احمد قادری

۱۲ صفر ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۸۵۵ عیسوی۔ تخت دہلی پر بہادر شاہ ظفر (م ۱۸۶۲ء)۔ بریلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت۔ خط نستعلیق۔ کتبہ جدید۔ شیخ اسد اللہ قادری صاحبزادگان نیوتنی شریف میں سے ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب شیخ المشائخ مولانا قاضی ضیاء الدین المعروف بہ قاضی جیا رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ قاضی اسد اللہ کو شرفِ بعیت و خلافت حضرت شاہ عین الحق عبد المجید بدایونی (م ۱۸۴۶) سے حاصل تھا۔[۵۵] قاضی اسد اللہ کی وفات بریلی میں ہوئی تھی۔ شکیل احمد قادری کے حالات جس نے کتبہ کا اہتمام کیا تھا، فراہم نہیں ہوئے۔

مقبرۂ شاہ دانا ولی کا طرزِ تعمیر ہشت پہلو ہے۔ ہشت پہلو چبوترے پر کمرۂ قبر کے باہر ہشت پہلو دالان ہے۔ نشان قبر کوہانی ہے۔ مقبرے کی چہار دیواری ہے۔ یہ طرز تعمیر ہندوستان میں مغلوں سے پہلے مروج تھا۔ اس مقبرے کی مرمت یا تعمیر ثانوی راجہ کمرندرائے صوبیدار بریلی بہ عہد اورنگزیب نے کرائی تھی۔ مقبرے پر مغلئی گنبد راجہ کمرندرائے کا تعمیر کردہ معلوم ہوتا ہے۔[۵۶] بریلی میں ہشت پہلو طرزِ تعمیر کا دیگر نمونہ مقبرہ سید حبیب شاہ بازار شہامت گنج میں ملتا ہے جو مقبرہ شاہ دانا ولی سے جانب جنوب تھوڑے فاصلے پر واقع ہے، شاہ دانا ولیؒ کو سید حبیب شاہؒ کا ہمعصر بتایا جاتا ہے۔[۵۷]

مقبرہ شاہ دانا ولی کے ۶۳۱ھ ہجری کے کتبے کی تصدیق مقبرے کے متعلق طرزِ تعمیر سے ہوتی ہے۔ یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان پر مغلیہ اقتدار سے پہلے ہی بریلی میں صوفیوں کا ورود ہو چکا تھا۔

مرزائی مسجد سولہویں صدی کے نصف اول میں بریلی کٹھیریا راجپوتوں کے قبضے میں تھا۔ جگت سنگھ بڑہل بریلی کا راجہ تھا، جس کے نام پر شہر کہنہ بریلی میں محلہ جگت پور ہے۔ اس راجہ کے دو لڑکے تھے، باس دیو بڑہل اور ناگ دیو بڑہل۔ راجہ جگت سنگھ کے فوت ہونے کے بعد باس دیو بڑہل جانشین ہوا۔ اس نے ۱۵۳۷ء میں بریلی کے جنگل میں وہ علاقہ آباد کیا جو اب شہر کہنہ کہلاتا ہے۔ اس نے ایک کوٹ یعنی قلعہ بھی تعمیر کرایا جس کے آثار پر محلہ کوٹ آباد ہوا۔ باس دیو بڑہل کے نام پر ہی باس بریلی نام پڑا جو اب بریلی کہلاتا ہے۔ ہمایوں کی وفات ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء کے بعد جب اکبر نے جلوس کیا، اس نے عباس علی خاں غرغشتی نغان کو باس دیو بڑہل کی تنبیہ کے لیے بھیجا۔ جنگ میں مغل فوج فتحیاب ہوئی اور باس دیو و ناگ دیو مارے گئے۔[۵۸] ۱۵۷۷ء میں کانت گولہ (شاہجہانپور) کی جگہ بریلی صدر مقام قرار پایا اور بریلی کا پہلا ناظم حکیم مرزا عین الملک شیرازی مقرر ہوا۔[۵۹] اسی عین الملک شیرازی نے جامع مسجد تعمیر کرائی جو مرزائی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی یہ مسجد گھیر جعفر خاں شہر کہنہ میں واقع ہے۔ اس مسجد کے بلند اور پرشوکت پیش منظر (FACADE فی ساد) کی درمیانی راہداری پر مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے:

ساعی خیر عین الملک	ساخت مسجد بامر اکبر شاہ
مومنا تراست سال تاریخش	فاسجدوا خالصاً لوجہ اللہ ۹۸۷ھ

یہ کتبہ خوبصورت ہے۔ لوح کو تراش کر پھول پنکھڑیاں بنائی گئی ہیں۔ خط نستعلیق ہے۔

چوتھے مصرع کے اعداد ۹۸۷ ہجری مطابق ۱۵۷۹-۱۵۸۰ عیسوی۔ کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا عین الملک شیرازی نے یہ مسجد اکبر کے حکم سے تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد بریلی میں پہلی مغل عمارت اور شاید بریلی کی پہلی جامع مسجد ہے۔ اس کتبے کو محکمۂ آثار قدیمہ نے اپنے ریکارڈ میں شامل کیا ہے[۱۰]

مرزائی مسجد میں مندرجہ ذیل منظوم فارسی کتبہ بہ خط نستعلیق مزید ملتا ہے جو تاریخ صوری میں ہے:

مظہر حق حامی شرع متین حقداد خاں ــــ کرد تعمیرش دگر بہر رضای کردگار
خواستم تاریخ سال از ہجرت شاہ رسل ــــ شمار آنہزار و یکصد و شصت و چہار

یعنی حقداد خاں نے ۱۱۶۴ ہجری / ۱۷۵۰-۱۷۵۱ء میں مسجد کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ یہ کتبہ بھی مسجد کے [illegible] پر ہے۔ اس وقت تخت دہلی پر احمد شاہ (م ۱۷۵۴ء) تھا اور بریلی نواب حافظ رحمت خاں روہیلہ کے زیر اقتدار تھا۔ حقداد خاں کے حالات معلوم نہیں ہوئے۔ اس کو کتبے میں "مظہر حق حامی شرع متین" تحریر کیا گیا جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ عالم دین یا حکومت کی جانب سے "خادم شرع" یا مفتی شہر تھا۔ اس کتبے کو بھی محکمۂ آثار قدیمہ نے اپنے ریکارڈ میں شامل کیا ہے[۱۱]۔

مرزائی مسجد کی چہار دیواری کے شمالی مشرقی گوشے میں سید قربان علیؒ کی قبر ہے جس کے سرہانے مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے:

۷۸۶

حضرت قبلہ سید قربان علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
عرف
دادا میاں رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ وصال ۲۲ رجب ۱۱۹۸ھ

خط نستعلیق اور کتبہ جدید ہے۔ تاریخ عیسوی ۱۰ جون ۱۷۸۴ء۔ اس وقت دہلی کے تخت پہ شاہ عالم (م ۱۸۰۶ء) تھا اور بریلی پر نواب آصف الدولہ (م ۱۷۹۷ء) کا قبضہ تھا۔ سید قربان علی کے حالات فراہم نہیں ہوئے۔

جامع مسجد قلعہ | شہر بریلی میں جہانگیر (م ۱۶۲۸ء) اور شاہجہاں (م ۱۶۶۶ء) کے دور حکومت کے آثار نہیں ملتے۔ اورنگزیب (م ۱۷۰۷ء) کے عہد حکومت میں راجہ مکرند رائے صوبیدار بریلی نے توسیع شہر پر توجہ دی۔ اس سے ایک قلعہ اور ایک مسجد کی تعمیر منسوب کی جاتی ہے۔ شہر بریلی کے غرب میں ڈیورنیاں ندی کے متصل قلعہ کا وجود تو نہیں رہا اب اس کے آثار پر محلہ قلعہ آباد ہے۔ جامع مسجد محفوظ ہے، جس کی تاریخ تعمیر ۱۶۶۸ء بیان کی گئی ہے[۱۲]۔ اس مسجد میں چار کتبات ہیں جن میں سے کوئی بھی ۱۶۶۸ء کا نہیں ہے۔ دو کتبے اہم ہیں، کیونکہ ان کے ذریعہ یہ اطلاع ملتی ہے کہ جامع مسجد کا باب عالی شان نواب نیاز احمد خاں عرف ببنے میاں نے تعمیر کرایا تھا۔ ان دو کتبوں میں سے ایک منظوم فارسی کتبہ بہ خط نستعلیق مندرجہ ذیل ہے:

۷۸۶

قطع تاریخ

آں نیک روش نیاز احمد خاں
مضبوط بنائے ایمانی کرد
یعنی باب جامع مسجد شایاں
تعمیر بہ فضل یزدانی کرد ۱۹۴۳ء

یہ کتبہ پتھر پر کندہ کر کے مسجد کے جنوبی مشرقی دروازے کی محراب کے نیچے نصب کیا گیا ہے۔ نواب نیاز احمد خاں المعروف بہ بنّے میاں کا سلسلۂ نسب نواب حافظ رحمت خاں سے ملتا ہے[12]۔ نواب نیاز احمد خاں کی وفات ۱۸۹۳ء میں ہوئی تھی۔ گویا نواب نیاز احمد خاں نے باب جامع مسجد کی تعمیر ۱۸۹۳ء میں یا اس سے پہلے کرائی تھی۔ جبکہ شایاں (سید تعظیم علی نقوی بریلوی۔ ثم کراچی۔ المتوفی ۱۹۹۰ء) نے یہ کتبہ ۱۹۴۳ء میں نظم کیا تھا۔ تاہم مسجد کا گنبد، کمرہ نماز، محرابیں، آرائش وغیرہ مغل طرز تعمیر کا نمونہ ہیں جن کے پیش نظر اس کو عہد عالمگیری کی عمارت ماننے میں تامل نہیں ہوتا۔

مسجد نو محلہ | اورنگزیب کے عہد آخر میں محمد مسیح الملقب بہ خیر اندیش خاں ثانی فرزند زادۂ محمد خاں کمبوہ المخاطب بہ خیر اندیش خاں عالمگیری بریلی کا ناظم تھا۔ اس نے بریلی میں قلعہ خیر نگر تعمیر کیا[13]۔ خیر نگر تو مشہور نہیں ہوا اس کی جگہ نئی آبادکاری کی وجہ سے عوام میں نو محلہ مشہور ہوا۔ قلعہ کا نام و نشان مٹ گیا۔ قلعہ سے متعلق مسجد باقی رہی جو مسجد نو محلہ کہلاتی ہے۔ اس مسجد کا طرز تعمیر عہد مغلیہ کے طرز تعمیر سے مستعار ہے۔ مرزا نظیر بیگ نائب تحصیلدار بریلی نے اس مسجد کا اگلا دالان تعمیر کرایا[14]۔ خان بہادر سردار محمد رحیم داد خاں نے مسجد کا احاطہ اور حوض تعمیر کرائے۔ اس مسجد میں خیر اندیش خاں عالمگیری کے زمانے کا کوئی کتبہ نہیں ہے۔ دو کتبے اسی صدی کے ہیں جن کا تعلق تعمیر ثانوی سے ہے۔ پہلا کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسجد نو محلہ اب تو خوب نادر بن گئی
رونق ایمان ہی مومن کی عز و جاہ ہی

کر دیا تھا جسکو پامال حوادث غدر نے
سجدہ گاہ اہل ایماں پھر وہی درگاہ ہی

عاصیو اسکی صدا سے پاؤ گی جنت میں گھر
اسکی ہر دروازہ سی باغ ارم کو راہ ہی

اس سی بہتر سبھی ہی کار خیر کی کوئی نظیر
یہ دل ممنون ہی واقف اس سی یا اللہ ہی

سچ اگر پوچھی کوئی یہ بھی تو اس ویرانہ میں
خانۂ حق کہہ دیا آباد حق آگاہ ہی

دیکھکر تعمیر اس کی دل نے رفعت یوں کہا
قبلۂ اہل ہدیٰ کیا خوب بیت اللہ ہی

۱۳۲۴ ہجری مطابق ۱۹۰۶ - ۱۹۰۷ء عیسوی۔ خط نستعلیق[15]۔ کتبہ پتھر پر کندہ کیا گیا جو مسجد کے فی سادے کے بائیں جانب راہداری کی محراب کے اوپر لگا ہوا ہے۔ کتبہ کسی شاعر المتخلص بہ رفعت نے تحریر کیا جس کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ کتبے سے یہ اطلاع ملی کہ مسجد نو محلہ ایام غدر ۱۸۵۷ء میں پامال ہو کر ویران ہو گئی تھی۔ اس کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس مسجد کی ہنگامہ غدر ۱۸۵۷ء میں پامالی کی تصدیق تاریخ کے اوراق سے ہوتی ہے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں یہ مسجد انقلابیوں کا مرکز بن گئی تھی۔ فوجی بغاوت کے قائد صوبیدار بخت خاں اور رسالدار محمد شفیع اور شہر کے غیر فوجی انقلابی اس مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے آتے تھے۔ خود سادات نو محلہ کے مقتدر افراد سید میاں جان اور سید فیض اللہ جن کا پٹھانوں پر غیر معمولی اثر تھا، انقلابیوں کے ہم خیال تھے[16]۔ چنانچہ ۶ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے بریلی پر قبضہ کرنے کے بعد نو محلہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ایک بھرا پرا محلہ ویران ہو گیا[17]۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد عورت بچے مقتول ہوئے۔ انگریزی فوج کی بربریت کے قصے برسوں تک زبان زد خاص و عام رہے۔ کتبے سے گمان ہوتا ہے کہ پامال مسجد کو اولاً مرزا نظیر بیگ نے تعمیر کرایا اور تعمیر ثانوی کے بعد شہر کے لوگ نماز ادا کرنے جانے لگے۔

اس مسجد میں دوسرا کتبہ خان بہادر سردار رحیم داد خاں ساکن محلہ گلاب نگر

بریلی سے منسوب ہے۔ خان بہادر رحیم داد خاں کے والد اللہ داد خاں رسالدار فوج انگریزی نے انگریزوں کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ان کی مدد کی تھی جس کے انعام میں ان کو جاگیر ملی اور وہ عہدہ رسالداری کے ساتھ بڑے زمین دار بن گئے تھے۔ خان بہادر محمد رحیم داد خاں (م ۱۹۳۳ء) انگریزوں کی طرف سے نامزد تحصیلدار تھے۔ میونسپلٹی بریلی کے چیرمین بھی تھے۔ وہ مدبر اور مخیر تھے۔ ان سے منسوب کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

اللہ اکبر

زسردار خاں بہادر مخیر	مرتب شدہ مسجد کہنہ بہتر
پئے سال تاریخ زد بانگ خواہاں	خوشا سجدہ گاہ آمد اللہ اکبر

۱۳ ۔۔ ۳۹

یہ حجری کتبہ خط نستعلیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ کتبہ مسجد کی درمیانی راہداری کے فی ساد پر لگا ہوا ہے۔ ۱۳۳۹ ہجری مطابق ۱۹۲۰ - ۱۹۲۱ عیسوی۔ خواہاں تخلص مولوی قاسم علی بریلوی (م ۱۹۳۸ء) کا جو بریلی کے مشہور استاذ سخن اور مربی سخن تھے۔

مسجد نو محلہ کی چہار دیواری کے شمالی مشرقی گوشے میں مولانا ناصر الدین احمد چشتی صابری قادری کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے میں قبر کے سرہانے شمالی دیوار میں ایک بڑا حجری کتبہ لگا ہوا ہے جو فارسی زبان، خط نستعلیق اور نثر و نظم میں ہے۔ کتبہ مولانا ناصر الدین احمد کے صاحبزادے اور خلیفہ فیضان احمد نے تیار کرایا۔ کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ناصر الدین احمد ابن و خلیفہ مولانا شاہ خواجہ طفیل علی کے تھے۔ انکا وطن رامپور ضلع سہارنپور تھا اور ان کی تدفین کے وقت مولوی احمد رضا خاں رضا بریلوی نے فی البدیہہ قطعہ تاریخ وفات موزوں کیا تھا۔ اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ناصر الدین احمد کی وفات ۴ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ ہجری (مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء) کو ہوئی تھی۔

مولانا ظفر الدین احمد المعروف بہ مولوی شفیع خواجہ ناصر المتخلص بہ ناصر صاحب علم و فضل تھے۔ فارسی اور اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ایک نعت گو کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے، انہوں نے متعدد کتب تالیف کی تھیں، جو طبع ہو چکی ہیں۔ ان کو مناظروں سے بھی دلچسپی تھی۔ بریلی میں ان کا حلقہ مریداں بہت وسیع تھا جس کی وجہ سے انکا قیام اکثر بریلی میں رہتا تھا۔ ان کی وفات بھی بریلی میں ہوئی[1]۔

مسجد چاند خاں اورنگزیب کی ۱۷۰۷ء میں وفات کے بعد ہندوستان میں سیاسی انتشار پھیلا۔ اس سیاسی انتشار کے دور میں کٹھیر میں روہیلہ پٹھانوں نے سیاسی قوت حاصل کی اور ان کے اقتدار کی وجہ سے کٹھیر کا نام روہیل کھنڈ پڑ گیا۔ عہد روہیلہ میں شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے روہیل کھنڈ میں لوگ آکر بسنے لگے، ایسے نوادر خاندانوں میں شاہجہاں پور اور اودھ کے شیخان بھی تھے، جن کی نسبت سے شہر کہنہ میں دو محلے نوادہ شیخان اور کٹرہ چاند خاں آباد ہوئے۔ والہ شفیع علی خاں المعروف بہ چاند خاں نے جس کے نام پر کٹرہ چاند خاں آباد ہوا۔ ایک مختصر لیکن مضبوط مسجد تعمیر کرائی جو کٹرہ چاند خاں میں واقع ہے۔ اس مسجد کے فی ساد پر ایک پتھر کا کتبہ لگا ہوا ہے، جس کی زبان فارسی اور خط نستعلیق ہے۔ اس کتبے پر رنگ کی دبیز تہ چڑھنے کی وجہ سے اس کا پڑھنا مشکل ہو گیا۔ لہذا کتبہ جزوی طور پر ہی پڑھا جا سکا۔ کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

الحمد	الحمد

ھوالحفیظنا......

۱۱۴۹

بدیں مبنی چاند خاں بامراد	بنا سجدہ گاہ کرد بہر نماز

[1] کذا فی الاصل۔

.... فرد گفت مسجد کبیت العتیق

عربی عبارت نسخ میں ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ کتبہ کسی زمانے میں مزین تھا۔ "مسجد کبیت العتیق" سے ۱۱۴۹ کے اعداد دستیاب ہوتے ہیں جو مطابق ہیں ۱۷۳۶-۱۷۳۷ عیسوی کے۔ اس وقت دہلی کے تخت پر محمد شاہ (م ۱۷۴۸ء) تھا اور ۱۷۳۶ء میں ہی روہیلہ سردار علی محمد خاں کو وزیر السلطنت دہلی کی طرف سے نوابی کا خطاب اور نوبت و علم رکھنے کی اجازت مرحمت ہوئی تھی۔[۲۰] اس کتبے سے چاند خاں اور کٹرہ چاند خاں کی تاریخی شہادت فراہم ہوتی ہے، یعنی عہد محمد شاہی میں یہ خاندان بریلی میں موجود تھا۔

مسجد جہاں خاں روہیلوں نے اپنے مختصر دور حکومت میں سیاسی بے چینی اور محاربات کے باوجود کثرت سے مساجد مقابر اور سیکولر عمارتیں یعنی پل چاہ گھاٹ اور سرائیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ نواب حافظ رحمت خاں کا تعمیر کردہ آنولہ (موجودہ تحصیل و قصبہ آنولہ ضلع بریلی۔ نواب علی محمد خاں کے عہد حکومت میں روہیلکھنڈ کا پایۂ تخت) میں نواب علی محمد خاں کا مقبرہ، پیلی بھیت کی جامع مسجد اور بدایوں میں لب ساگر تال درگاہ سید احمد بخاری کی حریم اور مسجد ان کے شوق تعمیرات کا ثبوت ہیں۔ نواب حافظ رحمت خاں کے امرا نے بھی عالی شان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ نواب دوندے خاں (م ۱۷۷۰ء) کی بسولی ضلع بدایوں میں جامع مسجد اور آنولہ ضلع بریلی میں احمد خاں بخشی کی بارہ برجی مسجد عالی شان اور مشہور عمارتیں ہیں۔ نواب حافظ رحمت خاں کے دیوان راجہ مان رائے کی بریلی میں حویلی (کٹرہ مان رائے) اور دیوان راؤ پہاڑ سنگھ کی گڈھی اور حویلی کے آثار رفعت گذشتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ عہد روہیلہ کی بریلی میں

ایسی عمارتیں بھی ہیں جن کا تاریخ میں مذکور ہوا لیکن ان کے کتبات ضائع ہو گئے۔ جیسے مسجد بدر الاسلام خاں (بازار ساہوکارہ۔ قلعہ روڈ۔ سنہ تعمیر ۱۷۴۵ء) اور مسجد بی بی جی (محلہ بہاری پور۔ سنہ تعمیر تقریباً ۱۷۷۴ء) وغیرہ۔ شہر کہنہ بریلی میں ایک تاریخی مسجد خاں جہاں خاں لودی کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ یہ مسجد محلہ لودی ٹولہ میں واقع ہے۔ شاید جہاں خاں نے ہی لودی ٹولہ آباد کیا تھا۔ جہاں لودی پٹھانوں نے بود و باش اختیار کی۔ اس مسجد کے پی سادہ پر مندرجہ ذیل فارسی کتبہ بہ خط نستعلیق ملتا ہے۔ یہ کتبہ بھی تاریخ صوری میں ہے:

مسجد جہاں خاں گر بنا کرد چوں خلیل — بہر خدا بساختہ چوں کعبۂ جلال

تاریخ آں ز ہجرت جستم خرد گفت — بود ست یک ہزار و صد و شصت و ہفت سال

یعنی ۱۱۶۷ ہجری جو مطابق ہیں ۱۷۵۱-۱۷۵۲ عیسوی کے۔ خان جہاں خاں لودی عہد جہانگیری (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۸ء) میں ایک مشہور امیر تھا۔ خلیل کا نام ایک دستاویز مورخہ ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹-۱۷۷۰ء کی مہر پر ملتا ہے۔ "مہر اللہ بنی خلیل خادم شرع"[۲۱] ممکن ہے یہ وہی خلیل ہوں جنھوں نے مسجد کی بنا رکھی اور اس کو خان جہاں خاں لودی کے نام سے منتسب کیا۔ مسجد جہاں خاں کی تعمیر کے وقت احمد شاہ (۱۷۴۸ تا ۱۷۵۴ء) دہلی کے تخت پر تھا اور بریلی و روہیلکھنڈ پر نواب حافظ رحمت خاں قابض تھے۔ مسجد جہاں خاں کا کتبہ خان جہاں خاں لودی اور محلہ لودی ٹولہ کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔[۲۲]

قبر عنایت خاں حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کو نواب شجاع الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرنل چیمپین (COLONEL CHAMPION)

کے توپ خانے کی مدد سے ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو جنگ روہیلہ میں شکست دی جسکے بعد پورا روہیل کھنڈ نواب شجاع الدولہ کی بربریت کا شکار ہوا[۳۳] جو کسر رہ گئی تھی وہ ہنگامہ غدر ۱۸۵۷ء میں پوری ہوگئی۔ بریلی میں قلعہ کمر نورائے اور قلعہ خیر نگر کا نشان نہیں رہا۔ حد یہ ہے کہ ان حویلیوں تک کا پتہ نہیں چلتا جن میں بریلی کے نوابین روہیلہ، صوبیدار، چکلہ دار اور فوجدار رہتے تھے۔ جملہ عمارتیں انہدام کی نذر ہوگئیں مسجدیں، مقبرے اور قبرستان تباہی سے بچ گئے لیکن کتبات ضایع ہوگئے۔ باغ عنایت خاں[۳۴] (موجودہ نام باقر گنج) کے گورستان میں کثیر تعداد میں اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے طرز تعمیر کی کشادہ مضبوط اور بھاری بھرکم قبور محفوظ ہیں۔ کتبہ صرف نواب عنایت خاں کی قبر پر ملتا ہے۔ یہ کتبہ بھی جدید ہے۔ سید الطاف علی بریلوی (م ۱۹۸۶ء) مولف کتاب حیات حافظ خاں (۱۹۳۴ء) کی مساعی سے نواب عنایت خاں اور نواب عظمت خاں کی قبور پر کتبات لگائے گئے تھے۔ جن کی مدت ساٹھ برس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ ان کتبوں میں سے بھی نواب عظمت خاں (م ۱۷۷۹ء) کی قبر پر لگا ہوا کتبہ ضایع ہوچکا ہے۔

نواب حافظ رحمت خاں کے جملہ پسران میں عنایت خاں پسر اکبر تھے۔ انکو نواب علی محمد خاں کی صاحبزادی منسوب ہوئی تھیں۔ ان کی شجاعت و دلیری زبان زد خاص و عام تھی۔ انہوں نے جنگ پانی پت (۱۷۶۱ء) میں مرہٹوں کے خلاف روہیلہ فوج کی قیادت کی تھی۔ انہوں نے جنگ بکسر (۱۷۶۳ء) میں چھے ہزار روہیلہ فوج کے ساتھ نواب شجاع الدولہ کی مدد انگریزوں کے خلاف کی تھی لیکن ان کو اپنے باپ کی سیاسی پالیسی سے اختلاف تھا اور ان کے دل میں اپنے برادر نسبتی نواب

فیض اللہ خاں (بانی ریاست رامپور۔ المتوفی ۱۷۹۴ء) کے لیے گنجایش نہیں تھی۔
نواب عنایت خاں کا انتقال بہ عمر ۳۲ سال ۱۱۸۷ ہجری / ۱۷۷۳ عیسوی کو ہوا۔ باغ عنایت خاں کے گورستان میں ایک مستطیل چبوترے پر ایک ہی طرز تعمیر کی تین قبور ہیں۔ درمیانی قبر نواب عنایت خاں کے حقیقی بھائی نواب عظمت خاں کی ہے اور اس کے غربی پہلو میں نواب عنایت کی قبر ہے جس کے سرہانے مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے۔:

محمد ۷۸۶

نواب عنایت خاں خلف اکبر مکرم الدولہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ
بماہ ذی الحجہ ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۳ء بعمر ۳۲ سال بعارضہ درد مثانہ انتقال و
در بلدۂ بریلی مدفون شدہ۔

کتبہ نستعلیق میں ہے اور سفید پتھر پر عبارت کندہ کی گئی ہے۔ سیاہ روشنائی کو آب جلا کی ضرورت ہے۔ اس کتبے کے ذریعہ نواب عنایت خاں کے مرض الموت یعنی درد مثانہ کا علم ہوتا ہے اور باغ عنایت خاں کے قبرستان میں ان کی قبر کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

مقبرہ نواب حافظ رحمت خاں یہ عالی شان مقبرہ ۱۹۸۹ء کی برسات میں منہدم ہوگیا۔ اس مقبرے کے تین کتبات محکمہ آثار قدیمہ نے محفوظ کیے تھے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مقبرے کے اندرونی دروازے کی محراب کے اوپر کتبہ جس سے حافظ الملک ناصر جنگ، رحمت خاں روہیلہ کی تاریخ وفات ۱۱ صفر ۱۱۸۸ ہجری کا علم ہوتا ہے۔ زبان فارسی خط نستعلیق۔ دو مصرعوں سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا کتبہ اندرون مقبرہ شمالی دروازے کے اوپر تھا۔ زبان فارسی خط نستعلیق۔ مصرعہ سے ۱۱۹۹ ہجری/ ۱۷۸۴-۱۷۸۵ عیسوی برآمد ہوتے ہیں۔ اس سنہ کا تعلق تعمیر مقبرہ سے ہے۔ سعدی کے اشعار بھی شامل کتبہ کیے گئے تھے۔ کاتب کا نام نصیرالدین حسن تھا۔

۳۔ تیسرا کتبہ مقبرے کے دروازے پر ۱۲۵۶ ہجری/ ۱۸۴۰-۱۸۴۱ عیسوی کا تھا۔ زبان فارسی خط نستعلیق۔ اس کتبہ کے متعلق " جنت نشان" مقبرے کی مرمت حافظ الملک کی صاحبزادی نے کرائی تھی۔[۲۵]

محکمۂ آثار قدیمہ کے جو کاغذات میرے سامنے ہیں ان میں کتبات کی تفصیل ملتی ہے اصل کتبات کی نقل نہیں ملتی۔ سید الطاف علی بریلوی نے تعمیر مقبرہ اور اس کی مرمت کے متعلق مفصل معلومات فراہم کی ہیں[۲۶] جن سے کتبات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

الطاف علی بریلوی کی اطلاع کے مطابق نواب ذوالفقار خاں (م ۱۷۹۷ء) ابن نواب حافظ خاں رحمت نے ناتمام مقبرہ مکمل کرایا تھا۔ مندرجہ بالا کتبہ نمبر ۲ کے مطابق یہ تعمیر ۱۱۹۹ ہجری میں ہوئی تھی[۲۷] زوجہ احمد خاں[۲۸] بنت نواب حافظ رحمت خاں نے مقبرے اور عمارات ملحقہ کی مرمت کرائی تھی اور گنبد پر طلائی کلس چڑھوایا تھا۔ مندرجہ بالا تیسرا کتبہ اسی مرمت کے متعلق ہے۔

نواب حافظ رحمت خاں اپنی شخصی زندگی میں متقی پرہیزگار عابد و زاہد تھے۔ ان کی شکست اور وفات اہل روہیلکھنڈ کے لیے سانحہ عظیم تھا۔ کتب تاریخ روہیلہ میں ان کی وفات کے سلسلے میں عربی فارسی پشتو اور اردو میں قطعات ملتے ہیں۔ ان میں ایک قطعہ نادر ہے جس کے آخری شعر کے مصرعہ ثانی سے تاریخ وفات دستیاب کی گئی ہے۔

قلم سالش بطرز نو رقم کن — دو انگشت از چہار انگشت خم کن

یعنی دو انگلیاں ۱۱ اور دو خمیدہ انگلیاں ۸۸ = ۱۱۸۸ ہجری

کچھ بعید نہیں کہ ضایع شدہ کتبات میں وہ اشعار موجود ہوں جو کتب تاریخ میں ان کی وفات کے سلسلے میں منقول ہوئے۔

مقبرۂ حافظ رحمت خاں کے جنوب میں خاندان روہیلہ کے مشہور صوفی اور مشہور نعت گو نواب حیدر حسین خاں حیدر (م ۱۸۷۷ء) کی قبر ہے۔ اس قبر پر کوئی کتبہ نہیں تھا۔ حال میں ہی قبر کے سرہانے ایک آہنی چادر کا تختہ (ہورڈنگ-HOAR-DING) لگا دیا گیا ہے۔ جس پر صاحب قبر اور ان کی سال وفات نستعلیق اور ناگری میں ملتی ہے۔

(باقی)

حوالجات اور حواشی

۱ J.F. FLEET, EPIGRAPHY, THE INDIAN EMPIRE, VOL, II, P, 133

۲ प्रो० कृष्णदत्त बाजपेयी, युग युग में अहिच्छत्रा, AHICCHATRA THROUGH THE AGES, P-72, PANCHAL RESEARCH INSTITUTE, KANPUR

۳ بریلی گزیٹیر ص ۱۰۔ یہ کتبہ بزبان سنسکرت سمبت ۱۰۴۸ مطابق ۹۹۲ عیسوی کا ہے۔ اس کتبہ میں راجہ للّا نے اپنا شجرۂ خاندان درج کرایا تھا۔ اس کتبہ سے یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ راجہ للّا اور اس کی رانی نے مندر تعمیر کرایا تھا۔ شاید راجہ للّا قنوج کے گرجر پرتیہار راجہ کے ماتحت بریلی اور بریلی بھیت کے علاقہ پر حکومت کرتا تھا۔

۴ नदरीदत्त पांडे कुमकँ का इतिहास, प्रठ ५६, देशभक्त प्रेस,

1937، ص ۱۳۳-۱۳۴ [7] ضیاء القادری بدایونی۔ اکمل التاریخ۔ حصہ اول۔ ص ۱۲۳۔
۱۲۴۔ بدایوں ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴-۱۹۱۵ء [8] حافظ محمد فضل اکرم فرشوری بدایونی نے ایک
دستاویز کے حوالے سے مطلع کیا کہ راجہ مکرند رائے ۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء تک بریلی کا صوبیدار
رہا تھا (آثار بدایوں۔ ص ۶۱-۶۲۔ بدایوں ۱۹۰۵ء)۔ گویا مقبرہ شاہ دانا ولی کی مرمت یا
تعمیر ثانوی ۱۶۶۹ء تک ہوئی تھی [9] عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی۔ تاریخ روہیل کھنڈ۔
ص ۲۰۳۔ کراچی ۱۹۶۳ء [10] شجرۂ خاندان سادات امروہہ ثم بریلی۔ غیر مطبوعہ۔ مملوکہ سید
محبوب حسین نقوی۔ ساکن محلہ ذخیرہ۔ نزد چاہ خرم بریلی [11] عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی۔
تاریخ روہیل کھنڈ۔ ص ۲۳ [12] DR. Z.A. DESAI, EPIGRAPHICA INDICA-
1969-ARABIC AND PERSION INSCRIPTIONS, CALCUTTA-1973
IBID, S.No. 347, UTTAR PAPDESH DISTRICT BAREILLY [13]
[14] عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی۔ تاریخ روہیل کھنڈ۔ ص ۲۵۲ [15] سید الطاف علی بریلوی۔
حیات حافظ رحمت خاں۔ طبع ثالث۔ ص ۳۳۲۔ کراچی ۱۹۸۲ء [16] حکیم نجم الغنی خاں۔ اخبار الصنادید
جلد ۱۔ ص ۵۱۰۔ لکھنؤ ۱۹۱۸ء [17] عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی۔ تاریخ روہیل کھنڈ۔ ص ۲۵۱
[18] DR. S.A.A. RIZVI, FREEDOM STRUGGLE IN UTTAR PRADE-
-SH, VOL V, P-170, EXTRACT FROM LETTER No 331 OF 1858
FROM COMMISSIONER, ROHILKHAND, TO SECRETARY TO
GOVERNMENT, N.W.P, DATED 30TH NOVEMBER 1858
[19] سید مصطفی علی بریلوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد نواب خان بہادر خاں شہید۔ ص ۱۸۶ تا
ص ۱۸۸۔ کراچی ۱۹۶۶ء [20] ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب۔ مضمون "مولوی ناصر الدین احمد ناصر"

ماہنامہ "آستانۂ ذکریا" ملتان۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء [21] عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی۔ تاریخ
روہیل کھنڈ۔ ص ۲۵۰-۲۵۱ [22] ایضاً۔ ص ۳۲ [23] ایضاً۔ ص ۲۶۸ [24] میں نے یہ کتبہ پچیس
تیس سال پہلے نقل کیا تھا۔ اس وقت کتبے کا کچھ حصہ ٹین کے سائبان میں دبا ہوا تھا۔ اشعار کی
تصدیق تو عاصی کی تاریخ روہیل کھنڈ، ص ۲۵۱ سے ہوگئی لیکن باقی عبارت جو ٹھیک طور پر
پڑھنے میں نہیں آئی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیل نے چاہ پل اور سرائے کی بھی بنا رکھی
تھی۔ اب پختہ سائبان بننے کے بعد صرف اشعار نمایاں ہیں [25] سید الطاف علی بریلوی۔ حیات
حافظ رحمت خاں۔ ص ۲۴۶ [26] ایضاً۔ ص ۳۱۳ [27] ARABIC AND PERSION-
INSCRIPTONS 1964-65 S.No. 348 TO 350, ASI NAGPUR:-
SOURCE-ANNUAL REPORT ON INDIAN EPIGRAPHY FOR THE
YEAR 1964-65, APPENDIXD, NOS 344-350, PP 171-72 [28]
سید الطاف علی بریلوی۔ حیات حافظ رحمت خاں۔ ص ۲۴۶ [29] آثار قدیمہ کے ریکارڈ میں نمبر
۳۴۹ کے سامنے کالم نمبر ۳ میں حکمراں خاندان (DYNASTY) کے تحت روہیلہ اور کالم نمبر ۴ میں بادشاہ
(KING) کے تحت ذوالفقار خاں درج کیا گیا ہے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۷۴ء میں روہیلوں کی حکومت
ختم ہوگئی تھی اور ۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ بریلی کا مالک تھا۔ نواب ذوالفقار خاں ابن نواب حافظ
رحمت خاں لکھنؤ میں مقیم تھے اور ان کو سالانہ وثیقہ ملتا تھا۔ اس طرح نہ روہیلہ حکمراں تھے اور نہ ہی
ذوالفقار خاں بادشاہ تھے۔ (حیات حافظ رحمت خاں/ ۳۳۰) [30] احمد خاں مشہور روہیلہ میر بخشی
سردار خاں کا فرزند تھا۔ اس نے جنگ روہیلہ (۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء) میں نواب شجاع الدولہ سے روہیلوں
کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ احمد خاں کو نواب حافظ رحمت خاں کی ایک صاحبزادی منسوب ہوئی تھیں
جن کا نام کسی کتاب یا دستاویز میں نہیں ملا۔ (حیات حافظ رحمت خاں / ص ۲۲۱)

جدید اسلامی دنیا کا دائرۃ المعارف

از

جناب شیخ نذیر حسین صاحب، لاہور

یورپ اور امریکہ سے آئے دن اسلامی موضوعات پر کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ کی زریں کڑی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (مطبوعہ لائیڈن، ہالینڈ) ہے، جس کی نظر ثانی شدہ نئی اشاعت کی آٹھ جلدیں شایع ہو چکی ہیں اور جو یورپی فضلاء کے علاوہ مسلم اہل قلم کی محنت و کاوش اور علمی لگن کا زندہ ثبوت ہیں۔ یہ جلدیں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی ادبیات کی تاریخ اور مسلم مشاہیر کے حالات کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

چند ماہ ہوئے کہ نیویارک (امریکہ) کے آکسفورڈ پریس نے آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف ماڈرن اسلامک ورلڈ (THE OXFORD ENCYCLOPAEDIA OF THE MOD-ERN ISLAMIC WORLD.) یعنی جدید اسلامی دنیا کا دائرۃ المعارف کی چار ضخیم جلدیں شایع ہوئی ہیں، جس میں ساڑھے چار سو فضلاء (امریکہ اور یورپ) کے مقالات مرقوم ہیں، یہ فضلاء اپنے ملک کے علمی اور تعلیمی اداروں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ ان میں چالیس پینتالیس کے قریب ترک، ایرانی، عرب، ہندی اور پاکستانی فضلاء کے مضامین بھی شامل ہیں۔ ان میں بعض اسکالر ادارتی مشیر بھی ہیں۔ ان جلدوں کے چیف ایڈیٹر مسٹر JOHN L. ESPOSITO جارج ٹاؤن

یونیورسٹی میں مذاہب اور بین الاقوامی معاملات کے استاد ہیں۔ ان میں موجودہ مسلم ممالک (انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک) کے مسلمانوں کی حالیہ سیاسی و دینی تحریکوں، جماعتوں اور اکابر مسلم رجال پر معلومات افزا مضامین ہیں۔ نو آزاد مسلم ممالک (بنگلہ دیش سے لے کر ترکستان، افریقہ اور مشرقی یورپ) کے حالات پر گرانقدر نگارشات ہیں۔

مسلمانوں کی سیاسی تحریکات کے سلسلے میں تحریک خلافت، مسلم لیگ، تحریک پاکستان، عوامی لیگ، جمعیۃ شبان المسلمین (قاہرہ)، تنظیم آزادی فلسطین، جمعیۃ اخوان المسلمون (مصر، شام، اردن، سوڈان)، رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)، حزب اسلامی (افغانستان)، حزب اللہ (ایران)، حماس (فلسطین) اور شرکت اسلام (انڈونیشیا) اور تحریک محمدیہ (جاوا) پر دلچسپ مقالات ہیں۔

مسلم ہندوستان کی دینی جماعتوں کے ضمن میں سید احمد شہید رائے بریلوی کی تحریک جہاد، سلفی تحریک، جمعیت علمائے ہند، جمعیت علمائے پاکستان، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور احمدیت کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ ہے۔ ہندوستان کے اکابر رجال میں سے شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز سے لیکر سید احمد شہید رائے بریلوی، سرسید احمد خاں، مولوی چراغ علی، سید امیر علی، علامہ اقبال، قائد اعظم محمد علی جناح، ابوالکلام آزاد، سید ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ پر دلچسپ مضامین ہیں۔ مصری مشاہیر پر جمال عبد الناصر کے علاوہ مفتی محمد عبدہ، سید محمد رشید رضا، شیخ مصطفیٰ المراغی، طٰہٰ حسین، سید قطب، خالد محمد خالد اور حسن البنا اور زینب الغزالی پر عمدہ نگارشات ہیں۔ ایرانی مشاہیر کے حوالے سے روح اللہ خمینی، علی شریعتی، سید محمد حسین طباطبائی (ایرانی مفسر قرآن) اور سید حسین نصر (مشہور ایرانی دانشور) اور انقلاب ایران کے حالات

ہیں۔ افغانی رہنماؤں کے سلسلے میں سید جمال الدین افغانی اور گلبدین حکمت یار کا تذکرہ ہے۔ ترک مشاہیر میں سلطان عبد الحمید دوم، سعید حلیم پاشا، اتا ترک مصطفیٰ کمال پاشا سعید نورسی اور ترغت اوزال اور غازی انور پاشا پر قابل قدر مضامین ہیں۔

لیبیا کے مشاہیر میں عمر المختار اور معمر القذافی نمایاں ہیں جبکہ مراکشی رہنماؤں میں علال الفاسی اور الجزائری مشاہیر میں عبد الکریم، جمیلہ بوہیری اور عبد الحمید بن بادیس پر اچھے خاصے معلوماتی مقالات ہیں۔ انڈونیشی اور چینی مسلمانوں کے بھی مفصل حالات ہیں۔ دلچسپ تذکرہ عالی جاہ محمد (امریکہ میں سیاہ فام مسلمانوں کے رہنما) کا ہے۔

دینی مقالات میں اجتہاد، احتساب، خراج، دعوت، زکوٰۃ، جہاد اور اسلامی ریاست وغیرہ پر قابل ذکر مضامین ہیں، دینی مسالک میں نقشبندیت، دیوبندیت، بریلویت اور سونک (بدیع الزماں نورسی سے منسوب ایک طریقہ) شامل ہیں۔ افریقہ میں مروجہ سلاسل تصوف میں ادریسیہ، مریدیہ اور تیجانیہ اور ترکیہ میں رفاعیہ کا علیحدہ علیحدہ مضامین میں ذکر ہے۔

اسلامی ادبیات میں عربی ادب، فارسی ادب، ترکی ادب، ترکستانی ادب اور ملائی ادب پر اچھے خاصے مقالات ہیں۔ اردو ادب کے عنوان کے تحت شاہ عبد القادر دہلوی، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، مولانا محمد قاسم، سر سید احمد خاں، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، ظفر علی خاں، مولانا ابو الکلام آزاد اور حضرت تھانوی کی علمی و دینی خدمات گنانے کے بعد مولانا شبلیؒ، سید سلیمان ندویؒ اور سیرۃ النبیؐ، دار المصنفین اور رسالہ معارف کا ذکر خیر ہے۔ اردو کے موجودہ نثر نویسوں اور شعراء کے ضمن میں خواجہ حسن نظامی اور فیض احمد فیض مذکور ہیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دیوبند اور علی گڑھ کی دینی اور دنیاوی درسگاہوں کے بین بین اعتدال پسند دانشگاہ ہے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے متعلق صرف یہ لکھا ہے کہ وہ رابطہ عالم اسلامیہ (مکہ مکرمہ) کے سرگرم اور فعال رکن ہیں۔ اہم مقالات میں غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے حالات، ان کی پستی اور معاشی مشکلات کا ذکر ہے۔ مسلم ممالک میں سائنسی علوم کی ترویج اور اسلامی عقائد سے مطابقت کی کوششوں کا ذکر خاصے کی چیز ہے۔

ساڑھے چار سو مقالات میں سے چیدہ چیدہ، منتخب اور اہم ترین مقالات کا تعارف سطور بالا میں آگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اسکالر مختلف مزاج، مختلف اذواق اور مختلف عقائد و نظریات کے حامل ہیں۔ ان کی فکر و نظر باہم مربوط اور نقطہ نظر بھی یکساں نہیں ہے، اس لیے اگر بعض مقالات میں وسعت اور گہرائی ہے تو بعض مقالات بالکل سرسری اور ناکافی ہیں۔ سیرت پاک (صلعم) کے مقالہ میں تضاد بیانی ہے۔

اپنی خامیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود یہ کتاب معاصر عالم اسلام کے حالات سے آگاہی، اسلامی ادبیات کی معرفت اور اسلامی دنیا کے اعاظم رجال سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اہل علم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ان چاروں جلدوں کی قیمت، پانچ ہزار روپے ہے۔

قاضی ارتضاء علی خاں گوپامئو

از

جناب عبید اللہ صاحب ایم۔ اے، مدراس

محمد مہدی واصف مدراسی نے جو اپنے دور کے مشہور مصنف تھے، اپنی عربی تصنیف حدیقۃ المرام (سنہ تصنیف ۱۲۷۰ھ) میں علمائے مدراس کا تذکرہ کیا ہے، اس تصنیف کا اردو ترجمہ سخاوت مرزا نے کیا ہے، ۱۹۸۲ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے طبع کیا ہے، محمد مہدی واصف نے اس تصنیف میں قاضی ارتضاء علی خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے "آپ متبحر عالم تھے علوم معقول و منقول میں بڑی مہارت تھی۔ تمام علوم کی تحقیق میں آپ کی عمر بسر ہوئی"۔

قاضی ارتضاء علی خاں گوپامئو میں پیدا ہوئے، ولادت کا سنہ ۱۱۹۸ھ تھا۔ والد ماجد کا نام حافظ احمد مجتبیٰ المخاطب مصطفیٰ علی خاں تھا۔ آبائی نسب حضرت عمر بن الخطابؓ تک پہنچتا ہے، ننہال کا سلسلہ حضرت امام حسنؓ سے ملتا ہے، والد ماجد سے عربی اور فارسی میں درس لیا، پندرہ سال کی عمر میں لکھنؤ چلے گئے، پھر مزید تعلیم کے لیے سندیلہ گئے، حیدر علی سندیلی سے منطق اور فلسفہ کا درس لیا۔ سندیلہ کے بعد بلگرام گئے، سات سال تک بلگرام میں قیام کیا۔ بلگرام اس زمانہ میں علم و تصوف کا مرکز تھا۔ محمد ابراہیم ملیباری سے علوم منقول و معقول کی تحصیل کی، سید

شاہ غلام نصیر الدین سعدی بلگرامی بن سید شاہ یٰسین بلگرامی سے بیعت فرمائی، سلسلہ صفوریہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ نقشبندیہ کی خلافت حاصل کی۔

۱۲۲۵ھ میں قاضی ارتضاء علی خاں مدراس گئے اور اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہنے لگے، نواب عظیم الدولہ (ناظم کرناٹک) کے دور میں ۳۵۰ روپیوں کے مشاہرہ سے آپ کو افتاء کی خدمت پر مامور کیا گیا، پانچ سال تک اس خدمت پر تھے، اسکے بعد استعفاء دے دیا۔ انگریزوں کے اقتدار کے موقع پر ضلع چتور (آندھرا پردیش) کا قاضی مقرر کیا گیا، بعد ۱۲۴۴ھ میں انگریزوں نے مدراس میں آپ کا قاضی القضاۃ کے عہدہ پر تقرر کیا۔ ۲۴ سال تک اس عہدہ پر برقرار رہے۔ پروفیسر کوکن اپنی کتاب "خانوادہ قاضی بدرالدولہ" میں رقمطراز ہیں:

"قاضی بدرالدولہ نواب غلام غوث خاں بہادر۔ (انتقال ۱۲۷۲ھ) تک قاضی القضاۃ کے عہدہ پر قائم رہے۔ ۱۲۱۶ھ میں کرناٹک پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز یہ چاہتے تھے کہ اپنی طرف سے ایک علحدہ محکمہ عدالت قائم کریں اور کسی مسلمان جید عالم کو قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور کریں۔ مگر چونکہ قاضی بدرالدولہ انگریزوں کا بائیکاٹ کیے ہوئے تھے، انگریزوں نے ۱۲۴۴ھ میں قاضی ارتضاء علی خاں کو اس جلیل القدر منصب پر منتخب کیا، ۱۲۶۶ھ تک اس منصب پر فائز تھے۔ قاضی بدرالدولہ ریاست کرناٹک کی طرف سے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے۔ اس کی وجہ سے مقدمات، معاملات کے فیصلوں میں دو عملی پیدا ہوگئی تھی مگر چونکہ عام لوگ قاضی بدرالدولہ ہی کے پاس اپنے مقدمے لے کر پہنچتے تھے، اس لیے انہیں کی عدالت کو زیادہ اہمیت تھی۔ نواب غلام غوث خاں کے انتقال کے بعد وہ قاضی القضاۃ

رہے، یہاں تک کہ ۱۳ شعبان سنہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۸ اپریل سنہ ۱۸۵۵ء کو ان کا محکمہ بند کر دیا گیا۔

قاضی ارتضاء علی خاں سنہ ۱۲۶۲ھ میں مع اہل و عیال حرمین شریفین روانہ ہوئے۔ واپسی کے وقت جہاز میں ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۸۱ھ بروز جمعہ بوقت اشراق بندر حدیدہ کے قریب وفات پائی۔ عمر ۷۰ سال تھی، جہاز میں آپ کے شاگرد خاص سید عبدالقادر بادشاہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جہاز کا رئیس محمد سعید منقطی آپ کا مرید تھا، آپ کی لاش سمندر میں چھوڑ دی گئی۔

قاضی ارتضاء علی خاں کے شاگردوں میں محمد یحییٰ علی خاں، سید محمد اسحاق طرازش خاں، محمد عبداللہ صدارت خاں، سید غلام رسول، محمد حسین راقم، سید وجیہ الدین، غلام قادر مشہور گزرے۔ ان تمام علماء کا تعلق شہر مدراس سے تھا۔

قاضی ارتضاء علی خاں صاحب تصنیف تھے۔ عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، عربی، فارسی کے علاوہ اردو میں بھی اشعار تحریر کیے ہیں۔ تخلص خوشنود تھا۔

کتب خانہ مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب مدراس میں قاضی ارتضاء علی خاں کے مندرجہ ذیل عربی اور فارسی تصانیف ہیں، موضوع منطق، فلسفہ، حکمت، تصوف ادعیہ وغیرہ ہیں۔

عربی مخطوطات

۱۔ شرح حاشیہ میرزاھد علی ملا جلال (۳ نسخے) ۲۔ الحاشیہ زاھدیہ علی جلالیۃ التھذیب (۴ نسخے) ۳۔ النفائس الارتضیہ (۵ نسخے) ۴۔ التصریح المنطق (۲ نسخے) ۵۔ ازلحۃ الاوھام عن مسئلۃ الکلام (۳ نسخے) ۶۔ شرح الحاشیۃ الزاھدیہ علی الرسالۃ القطبیہ (۸ نسخے) ۷۔ تبصرۃ الطالبین (۲ نسخے) ۸۔ شرح قطبیہ عین العلم ۹۔ حاشیہ صدرا ۱۰۔ الحاشیۃ علی حاشیۃ میرزاھد علی الرسالۃ التصور والتصدیق ۱۱۔ حاشیہ صدرا علی مبحث جزو لایتجزیٰ۔

فارسی مخطوطات

۱۔ تنبیہ الغفول فی اسلام آباء الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ۲۔ فتویٰ ارتضاء علی خاں ۳۔ فتویٰ دربارہ فرقہ مہدویہ ۴۔ رسالہ در سلوک ۵۔ رسالہ مناسک ۶۔ فرائض ارتضیہ ۷۔ مراصد الارتضیہ فی شرح الکواکب المضیئۃ ۸۔ ردوہابیہ ۹۔ فتویٰ درعقاید ۱۰۔ فرائض ارتضیہ ۱۱۔ رسالہ در منشاء ۱۲۔ نقود الحساب ۱۳۔ رسالہ شرح جمل کات ۱۴۔ مکتوبات ارتضائیہ ۱۵۔ ترجمہ شرح الصدور فی شرح الموتیٰ والقبور ۱۶۔ رسالہ اذکار ۱۷۔ مواہب سعدیہ ۱۸۔ شجرہ قادریہ وسہروردیہ ۱۹۔ شرح اسماء حسنیٰ ۲۰۔ رسالہ در طریقت حفظ اوقات بانواع نوافل و عبادات ۲۱۔ فوائد سعدیہ ۲۲۔ مجمع الاعمال ۲۳۔ رسالہ در طریق بیعت گرفتن ۲۴۔ رسالہ در منشاء حدوث مذہب مہدویہ در بلاد جنوب ہند۔

اخبار علمیہ

بوسنیا ہرزی گووینا میں قریب تین سال سے بپا ظلم و غارت گری کا انتہائی خوفناک طوفان اب تھمتا نظر آتا ہے، اس صدی کی سب سے شدید بہیمیت کا شکار ہونے والے بوسنیائی مسلمان اس امتحان سے کامیاب اور سرخرو ہو کر نکلے ہیں، مذہبی اور نسلی عصبیت نے انسانیت کے ساتھ تہذیب و ثقافت کے جو بیش قیمت آثار و نقوش بھی مٹا ڈالے ان میں سب سے قابل ذکر بوسنیا کے دار السلطنت سرائیوو کے کتب خانہ غازی خسرو بیگ اور وہاں کی قومی لائبریری کی بربادی ہے، اب ترکی کے ادارہ (IRCICA) کے خبرنامہ میں اس قومی لائبریری کے ناظم ڈاکٹر انیس کوجنڈزک (ANES KUJUNDZIC) کے ایک مضمون سے معلوم ہوا کہ کتب خانہ کی تنظیم جدید کا عمل شروع ہو چکا ہے، پندرہویں صدی سے بیسویں صدی عیسوی تک کے اہم مخطوطات و مطبوعات کا خزانہ اس کی تحویل میں تھا جن کی تعداد تقریباً بیس لاکھ تھی، لیکن بمباری کا نشانہ بن کر یہ ساری دولت خاک میں مل گئی، جو چھوٹا سا حصہ محفوظ رہا اس میں پانچ سو اسلامی علوم کے مخطوطات بھی ہیں۔ یہ عربی فارسی، ترکی اور بوسنیائی زبانوں میں ہیں، بوسنیائی زبان کا ایک رسم الخط عربی بھی ہے اور اسے ALHAMIJADO LITERA-TURE کہا جاتا ہے، اس ذخیرہ میں قرآن مجید و تفسیر و تجوید کے ۵۸، عقائد میں

۵۴، فقہ میں ۱۷۲، اخلاق میں ۹۶، فلسفہ و منطق پر ۲۹ اور تاریخ پر ۱۵ مخطوطے ہیں، ان میں قرآن مجید کا ایک نسخہ حسین بوسنیاک کی خطاطی کا نادر نمونہ ہے جو ۱۷۵۱ء کا لکھا ہے، سب سے قدیم کتاب زین الدین ابوبکر سجستانی کی نزھۃ القلوب فی تفسیر غریب القرآن الکریم ہے، علمائے بوسنہ کے بعض مخطوطات بھی اہم ہیں جو بوسنیائی زبان کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی ہیں مثلاً حسن کافی (PRUSCAK) کی کتاب 'اصول الحکم فی نظام العالم' اور 'نور الیقین فی اصول الدین' شیخ یوسف ہوستاری کی 'بدر المعالی فی شرح الامالی' اور اٹھارہویں صدی میں بوسنیا کے مشہور مفتی محمد بوسنیاک کے خلف الرشید حاجی احمد کے فتاوائے احمدی وغیرہ، ان کے علاوہ دیوان حافظ کی ایک شرح بھی ہے جو مشرقی بوسنیا کے احمد سودی کے قلم سے ہے۔

کتابوں کے سلسلہ میں یہ دلچسپ خبر بھی نظر سے گذری کہ برطانیہ کی پولیس نے ڈنکن جیوون نامی ایک شخص کو ایک کتاب کی چوری کے معاملہ میں گرفتار کر لیا، یہ شخص فلسفہ و مذہب کا کبھی طالب علم تھا اور ایک عرصہ سے ترکی میں کہیں ملازم تھا، اس کو گرفتار کرنے پولیس جب اس کے گھر گئی تو معلوم ہوا کہ وہاں ہزاروں کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ موجود ہے اور یہ سب اس سارق کتب شخص نے مسلسل تیس سال تک چوری کے ذریعہ جمع کیا، اب پولیس نے ان تمام کتابوں کو نیلام کر دیا ہے۔

کتابوں کے سرقہ کے واقعات باعث حیرت و استعجاب ہو سکتے ہیں، لیکن آج عالمی تجارت میں کتابوں کی طباعت و اشاعت کے اعداد و شمار کم تعجب خیز

نہیں؛ حال ہی میں ایک رپورٹ سے معلوم ہوا کہ دنیا کے دس بڑے ناشرین کتب ملکوں کی فہرست میں ہندوستان بھی شامل ہے، خاص طور پر انگریزی کتابوں کی اشاعت میں امریکا اور برطانیہ کے بعد یہی سب سے بڑا ملک ہے ۹۴-۹۵ء میں ہندوستانی ناشرین نے بیرونی ممالک میں اپنی مطبوعات کے عوض میں ۸۹۰ ملین روپے حاصل کیے یعنی یہ تجارت تقریباً سالانہ ایک ہزار کروڑ روپے کی ہے، گذشتہ سال کے مقابلہ میں اس سال ۲۷ فیصد کا اضافہ ہوا، لیکن عالمی بازار میں یہ اعداد و شمار دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت کم بلکہ ایک اندازہ کے مطابق ۱:۱۰۰ کے تناسب سے ہیں، طباعت و اشاعت کے ماہرین اس صورتحال سے پریشان ہیں کہ آخر برآمد کے معاملہ میں یہ خراب صورتحال کیوں ہے، جب کہ ہندوستانی کتابیں زیادہ ضخیم ہوتی ہیں اور قیمت میں امریکی و برطانوی کتابوں کے مقابلہ میں ۱۰ سے ۱۵ گنا تک کم بھی ہوتی ہیں؛ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے اسباب میں حکومت اور بینکوں کے ناموافق شرائط و قوانین اور کاغذ کی روزافزوں گرانی خاص ہیں اور دوسری وجوہات میں یہ بھی ہے کہ ہندوستانی ناشرین کتابوں کی برآمد اور بیرونی بازاروں کی تلاش میں بے حس اور بازار کے رجحان سے بے خبر ہیں، جیسے مغربی ممالک میں ہندوستان کی علمی کتابوں کے مقابلہ میں یہاں کے قدیم تاریخی و تمدنی ورثہ سے متعلق کتابوں سے زیادہ دلچسپی ہے جبکہ افریقہ میں صورتحال اس کے برعکس ہے، چنانچہ گذشتہ سال برطانیہ میں ۹۰ ملین؛ امریکا میں ۱۱۴ ملین حتی کہ بنگلہ دیش میں ۸۰ ملین کی ہندوستانی مطبوعات فروخت کی گئیں، جبکہ افریقہ میں صرف ۴۰ ملین روپے کی فروخت ہوئیں؛ حالانکہ ۵۴

افریقی ملکوں میں قریب نصف کی زبان انگریزی ہے، خود ہندوستان کے بازار میں کتب فروشی کے وسیع امکانات ہیں لیکن ناقص منصوبہ بندی اور حکومت کی ناموافق روش کی وجہ سے اندرونی بازار میں غیر ملکی کتابوں کا غلبہ ہے، ایک ناشر نے کہا کہ ہم ۴۰۰ سے ۵۰۰ کروڑ تک کی کتابیں درآمد کرتے ہیں اور صرف ۹۰ کروڑ کی برآمد پر قانع ہیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۲۰ سال قبل درآمد کے مقابلہ میں ہماری برآمد دوگنی سے زائد تھی، اندرونی بازار میں اس ناکامی کے اسباب میں چھوٹے ناشرین کی کثرت اور اس صنعت کی باضابطہ تربیت کا فقدان بھی شامل ہے، اس وقت ملک میں ۱۱,۲۶۶ ناشرین کتب ہیں ان میں ۸۰۰۰ ایسے چھوٹے ناشر ہیں جو اپنی تجارت سے بالکل ناواقف اور مالی لحاظ سے کمتر ہیں، حتی کہ بعض متوسط درجہ کے اشاعتی اداروں میں کوئی باقاعدہ مینیجر نہیں، ملک میں سالانہ چالیس ہزار نئی کتابیں طبع ہوتی ہیں لیکن نیشنل لائبریری میں صرف ۲۰ ہزار کا ہی اندراج ہوپاتا ہے یعنی نصف سے زیادہ کتابیں اس اندراج سے محروم رہتی ہیں جو ان کے تعارف کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے، اس غفلت پر کسی سزا و جرمانہ کی بھی کوئی دفعہ قانون میں نہیں ہے، رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ۸۵ء سے ۹۱ء تک ہندوستان میں مختلف زبانوں میں ۱۹۵,۵۲۳ کتابیں شایع ہوئیں، اگر کاغذ کی روزافزوں گرانی پر قابو پالیا جائے تو عین ممکن ہے کہ ہندوستان طباعت کے علاوہ کتب فروشی میں بھی دنیا کے بڑے ممالک میں جگہ بنالے، بقول آر سی گوئل صدر انجمن ناشرین ہند (FIP) ۸۸ء میں کاغذ ایک سال میں تین بار اور ۹۰ء میں

دو بار گراں ہوا، اب ۱۹۸۸ء کے مقابلہ میں یہ ۱۲۰ گنا مہنگا ہے، ڈاکٹر امریک سنگھ نے بتایا کہ برطانیہ اور امریکہ میں ایک کتاب کی قیمت میں کاغذ کی قیمت ۲۰-۲۵ فیصد ہوتی ہے، لیکن ہندوستان میں ۶۰ فی صد ہے، اس لیے کتابوں کا گراں ہونا اور عالمی بازار میں ان کا پیچھے رہ جانا لازمی امر ہے۔

کتابوں کے اربوں کھربوں کے کاروبار کی خواہش اور کاغذ اور دوسری مشکلات کا شکوہ ایک جانب ہے تو دوسری طرف امریکا کے روجر فڈلر کا یہ اعلان بھی ہے کہ "کاغذی اخباروں کا دور بہت جلد ماضی کی داستان کا حصہ بن جائے گا"، فڈلر نے مستقبل کے اخبارات کے لیے کاغذ کی بجائے پلاسٹک کی طرح نظر آنے والے ایک جدید کاغذ کی ایجاد میں کامیابی حاصل کی ہے، یہ ایک ٹکیہ TABLET قسم کی چیز ہوگی، ایک کلوگرام سے کم اور ۲ سینٹی میٹر دبیز، لیکن فل سکیپ صفحہ کی مانند جیسے ہی اس کے (LCD) (LIQU-ID CRYTAL DISPLAY) اسکرین کو چھوا جائے گا فوراً پہلا صفحہ سامنے آجائے گا، متعدد بار LCD کو چھونے پر ویڈیو کلپس، خاکے، تصویریں غرض اخبار کا سارا مواد پیش نظر موجود ہوگا، امید ہے کہ یہ جدید الکٹرونی اخبار ۱۹۹۷ء میں امریکا کے بازاروں میں آجائے گا اور اگر منصوبہ حسب خواہش مکمل ہوتا رہا تو ۱۵ سال میں امریکا کے ۵۰ فی صد گھروں میں یہ اخباری ٹکیہ کاغذی اخباروں کی جگہ لے لے گی، کاغذی اخباروں کے علاوہ یہ گھریلو کمپیوٹروں کے اسکرین پر ظاہر ہونے والے اخباروں کو بھی بے اثر کر دے گی،

کیونکہ بقول فڈلر ناشتہ کی میز پر کمپیوٹر مانیٹر، کی بورڈ وغیرہ کی زحمت کون برداشت کرے گا اور ساحلوں اور ریستورانوں میں ان سب کو کون لیجائیگا جبکہ یہ اخباری ٹکیہ ہر جگہ اور ہر وقت بآسانی ساتھ رکھی جا سکتی ہے فڈلر کی یہ ایجاد بھی اتنی ہی حیرت انگیز ہے جتنی خود ان کی زندگی، انھوں نے اخباری زندگی کا آغاز گیارہ سال کی عمر میں ہاکر کی حیثیت سے کیا، باقی ۴۱ برس میں وہ نامہ نگار، کالم نگار، ڈیزائنر، فوٹو گرافر، اخباری مشیر اور آرٹ ڈائرکٹر بنتے چلے گئے، گذشتہ دو سال سے وہ انفارمیشن ڈیزائن لیبوریٹری (IDL) کے سربراہ ہیں، یہ تجربہ گاہ اب ذرائع ابلاغ کی ترسیل و اشاعت اور نئی راہوں کی دریافت کا اہم مرکز ہے، اس کی آمدنی ڈھائی بلین ڈالر کی ہے اور مطبوعات کے علاوہ یہ امریکا میں ۱۲۹ اخبارات شایع کر رہی ہے۔

جرمنی میں میونخ کے فران ہوفر انسٹی ٹیوٹ کے سائنسدانوں نے ایک نہایت باریک پمپ کی ایجاد میں کامیابی حاصل کی ہے، یہ مائکرو پمپ حد درجہ نازک اور مختصر ہونے کے علاوہ خود بخود رخ بدلنے والا بھی ہے، یہ ایک یونٹ پانی کے ۱۰۰/۱ حصہ کو جو فی زبان ہیں ۵۰ نینو لیٹر ہوتا ہے ایک نلکی میں آسانی سے گزار سکتا ہے، اس پمپ میں چار غیر فلزاتی ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ دیا گیا ہے، سائنسدانوں کی نگاہ میں علاج معالجہ میں یہ بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے، اس کے دائرہ کار میں علاج کے بعض انتہائی نازک اور دشوار مرحلوں کو نزاکت اور باریکی سے قابو میں کر لینے کے علاوہ چھوٹی سی چھوٹی مقدار میں دوا بنا لینے کی صلاحیت ہے، مصنوعی لبلبہ کے ساخت و نصب میں بھی یہ مائکرو پمپ بہت مفید و معاون ہو سکتا ہے۔

ع۔ ص

مطبوعات جدیدہ

چراغ محمد

از جناب مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۴۲۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: دار الارشاد مدنی روڈ، اٹک شہر، پاکستان۔

برصغیر کی بیسویں صدی کی تاریخ میں جن علمائے دعوت و عزیمت کے سوانح نمونہ اسلاف اور لائق اتباع ہیں، ان میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نام نمایاں ہے، ان کے سوانح پر مشتمل چھوٹے بڑے متعدد تذکرے شایع ہو چکے ہیں، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی جامع و مبسوط کڑی ہے، فاضل مولف نے اگرچہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کو نہ تاریخی نظر سے دیکھا جائے نہ ادبی اور علمی بلکہ ایک مخلص خادم کے جذبات کی ترجمانی سمجھا جائے، لیکن انہوں نے جس محنت و تحقیق سے یہ تذکرہ مرتب کیا اس سے تصنیف و تالیف میں ان کا حسن ذوق و سلیقہ ظاہر و عیاں ہے، مولانا مدنی کا تاریخی نام چراغ محمد ہے، کتاب کے لیے فاضل مولف نے اسی اسم با مسمی کا انتخاب کیا اور خاندانی حالات، تعلیم، مدینہ منورہ میں قیام، حضرت شیخ الہند سے تعلق، ریشمی رومال کی تحریک، اسارت مالٹا، دیوبند میں تدریس اور وہاں کی تطہیر، جمعیۃ العلماء میں شرکت، تقسیم ہند اور اس کے اثرات، تلامذہ و تصانیف وغیرہ موضوعات پر مفصل مباحث کے علاوہ ایک حصہ میں مولانا مدنی کا روحانی فیض اور خدمت خلق کے بے مثال جذبہ کے واقعات بھی بیان کیے ہیں، بعض معاصر اسلامی تحریکوں اور علامہ اقبال سے اختلافات وغیرہ بھی

اس جامعیت سے بیان کر دیے گئے ہیں کہ یہ تذکرہ برصغیر کی تاریخ خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ ہو گیا ہے، نیز مولانا مرحوم کے خطوط، خطبات، تقریریں و پسندیدہ اشعار کا انتخاب بھی دے دیا گیا ہے، کتاب میں بعض اہل قلم جیسے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا محمد عبد القدوس، سید انور حسین نفیس رقم کے مضامین بھی نقل کر لیے گئے ہیں، البتہ زبان و بیان میں کہیں کہیں ناہمواری ہے، جیسے فطری یا قدرتی کی بجائے فطرتی اور اپنی نسب وغیرہ، بعض مباحث میں بھی بے ترتیبی ہے اور کچھ دعوے بھی محل نظر ہیں جیسے یہ کہنا کہ چونکہ دوسری اقوام میں نکاح اور نکاح کے محرمات و محللات کی ضرورت نہیں، نہ ہی ان میں وراثت کا ضابطہ موجود ہے اس لیے ان اقوام کے ہاں نسب کی کوئی ضرورت نہیں، اسی طرح ایک اقتباس انگریزوں کے مظالم کے سلسلہ میں نقل کیا گیا ہے لیکن اس سے کسی ظلم کا پتہ نہیں چلتا۔

تحریک ہجرت

مرتبہ از جناب شاہد حسین خان، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۴۲، قیمت ۴۵ روپے، پتہ: مکتبہ شاہد، علی گڑھ کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰، پاکستان۔

ہندوستان میں سنہ ۱۹۲۰ء میں جب تحریک خلافت کا عہد شباب تھا، ہندوستان سے افغانستان کے لیے مسلمانوں کی ہجرت کی تحریک شروع ہوئی، اس کی سب سے بڑی وجہ انگریزوں سے شدید نفرت کا جذبہ تھا، جوش و ہیجان پر مبنی دوسری تحریکوں کی طرح یہ بھی کامیاب نہیں رہی، لیکن انگریزوں سے نجات اور ملک کی آزادی کے حصول میں اس کے دور رس اثرات و نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ موضوع تفصیل طلب اور غیر جانبدارانہ اور گہری مورخانہ نظر و بصیرت کا متقاضی ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی

ایک کوشش ہے، کتاب میں اصل موضوع پر ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مقالہ سے روشنی پڑتی ہے، ان کا یہ مقالہ عرصہ ہوا ایک مجلہ میں شایع ہوا تھا، اس کو اور چند دوسرے اہل قلم کی تحریروں اور اس سلسلہ کی بعض اہم دستاویزوں کو لایق مرتب نے یکجا کردیا ہے تاکہ موضوع پر مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوسکے، ظاہر ہے بعض نتائج سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے، مثلاً ڈاکٹر معین الدین عقیل کا یہ کہنا کہ تحریک ہجرت بالآخر برعظیم پاک و ہند کو اشتراکیت سے متعارف کرانے کا سبب اور اس کی توسیع کے لیے خود ایک وسیلہ بن گئی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے خیالات بھی بے ربط اور جابجا اسلوب کے اعتبار سے بھی بہت سخت ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس موضوع پر وہ غور و فکر کے لیے آمادہ کرتے ہیں اور یہی کتاب کا مقصد ہے۔

اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج

از جناب اسرار عالم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۱۴۴، قیمت ۳۵ روپے، پتہ: مکتبہ ذکری، مٹیا محل دہلی ۶۔

عالم انسانیت کی فوز و فلاح کے لیے اسلام کی تعلیم و پیام ابدی ہے، انقلابات زمانہ کے تنوع اور دنیا کے گوناگوں مسائل و مشکلات کے باوجود اس کا علاج نشاط انگیز اسی دین فطرت میں ہے، اس مختصر لیکن حد درجہ مفید کتاب میں اسی حقیقت کی روشنی میں اکیسویں صدی کے متوقع مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے اور فساد فی الارض کی بعض نئی صورتوں جن سے انسان کی سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی ایک مکمل تباہی سے دوچار ہے، ان سے باخبر کرکے اسلام کے نسخہ کیمیا کی اہمیت و افادیت کو عقل و روح کی میزان میں رکھ کر لایق مولف نے پیش کردیا ہے، کتاب پڑھنے کے لایق ہے۔

ع۔ ص۔